وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۶

اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ کے ذمہ ہی اس کا رزق ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک کھلی کتاب میں ہے۔ (1443)

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۷

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا، اور اس کا عرش پانی پر ہے تاکہ تمہیں آزمائے کون تم میں سے اچھے عمل کرنے والا ہے۔ اور اگر تو کہے کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو جو کافر ہیں کہیں گے یہ تو صریح جادو ہے۔ (1444)

1443 - دَآبَّةٍ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 202] اور مُسْتَقَرَّ اور مُسْتَوْدَعَ کے لیے [دیکھو نمبر: 989]۔

تمام جانداروں کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے سب سامان پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ انسان کو معاش یا رزق کی فکر نہیں کرنی چاہیے بلکہ [آیت: 3] کے مضمون کی طرح اس کا مضمون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے سے انسان سے دنیا کے سامان چھن نہیں جاتے بلکہ رزق تو ہر حال میں پہنچ سکتا ہے، نیکی کے اختیار کرنے سے رزق نہیں رک جاتا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کفار طرح طرح کی اذیتیں مسلمانوں کو پہنچاتے تھے اور اس سے قبل شعب ابی طالب میں محصور کر کے سامان خوراک وغیرہ بھی ان تک پہنچنا بند کر دیا تھا۔ پس جب پچھلی آیت میں کفار کی عداوت کا ذکر کیا تو یہاں مسلمانوں کو تسلی دی کہ وہ رزق کے سامانوں کو تم سے نہیں چھین سکتے۔ اس کے یہ معنی لینا کہ گھر بیٹھے رہو وہیں رزق پہنچ جائے گا درست نہیں۔ ہر ایک جانور اپنے رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چڑیا اور چیونٹی بھی رزق کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے سامان ان کے لیے بھی پیدا کر رکھے ہیں۔ انسان کے لیے بھی اور یہاں پر دابۃ یعنی جاندار کا ذکر ہے اور جاندار اور بے جان میں جیسے نباتات وغیرہ امتیاز یہ ہے کہ جانداروں کو اپنا رزق اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ چلیں اور پھریں اور نباتات وغیرہ اپنا رزق اسی حالت میں پالیتی ہیں جس حالت میں وہ ہوتی ہیں اور یہ جو فرمایا کہ اس کا مستقر اور مستودع جانتا ہے تو اس میں دونوں زندگیوں کی طرف اشارہ ہے جس کی تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

1444 - چھ یوم میں آسمان اور زمین کی پیدائش کے لیے [دیکھو نمبر: 1094]۔ ابن جریر نے ضحاک اور کعب سے روایت کی ہے کہ یہ یوم

وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ع 1 8 1

اور اگر ہم ان سے عذاب کو ایک مقرر وقت تک پیچھے ڈال دیں تو کہیں گے اسے کس چیز نے روک رکھا ہے۔ سنو جس دن ان پر آئے گا پھر ان سے ٹلے گا نہیں اور وہ چیز ان کو گھیر لے گی، جس پر یہ ہنسی کرتے تھے۔ (1445)

ہزار سال کا تھا۔ مگر اصل حقیقت وہی ہے جو وہاں بیان ہوئی ہے کہ مراد چھ ایام سے چھ حالتیں ہیں اور یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ ہر حالت میں کتنا وقت لگا۔

﴿كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ عرش کے لیے [دیکھو نمبر: 1095]۔ مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ خلق سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور بخاری میں ہے: [كَانَ اللهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهُ، وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ] (صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، حديث: 7418) جس کی تشریح میں ابن الکمال لکھتے ہیں کہ اس کے عرش سے مراد اس کی قیومیت ہے اور ماء میں اشارہ صفت حیات کی طرف ہے۔ (ر) جہاں تک عرش کا سوال ہے [نمبر:1095] میں دلائل قطعیہ سے دکھایا جا چکا ہے کہ جس طرح کرسی سے مراد علم ہے، عرش سے مراد قدرت ہے۔ پس عرش کے یا نفاذ قدرت کے پانی پر ہونے سے کیا مراد ہے؟ دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے: ﴿جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [الأنبيآء: 30:21] ہر ایک زندہ چیز کو پانی سے بنایا اور یہاں اس سے پہلی آیت میں دابۃ یعنی جانداروں کا ذکر ہے۔ پس قرینہ چاہتا ہے کہ جب آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا تو جانداروں کی پیدائش کا بھی ذکر کیا اور اس سے انسان کی زندگی کی طرف اشارہ کر کے آگے فرمایا ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ جس کی تقدیر بعض مفسرین نے بھی یوں نکالی ہے [وَخَلَقَكُمْ لِيَبْلُوَكُمْ] یعنی تمہارے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ اس بات کو انجام کار ظاہر کرے کہ اچھے عمل کون کرتا ہے۔ پس ﴿عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ میں انسان کی زندگی کی ابتدا کی طرف اشارہ ہے اور یہ حقیقت آج تمام سائنس دانوں کے نزدیک مسلم ہے کہ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی اور اصل غرض یہ بتانا ہے کہ جو پہلی زندگی کو اس قدر باریک راہوں سے وجود میں لایا اس کے اس ارشاد پر کہ موت کے بعد بعث ہوگا اور ایک دوسری زندگی ہوگی کیوں اس قدر تعجب کرتے ہو کہ اسے ﴿سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ کہتے ہو۔ اور یہاں ﴿سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ کسی معجزہ کو نہیں کہا بلکہ اس بیان کو کہ موت کے بعد بعث ہوگا ﴿سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ کہا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ یہ محض دھوکہ ہے ایسا کہاں ہو سکتا ہے۔

1445 - اُمَّةٍ کے لیے [دیکھو نمبر: 163]۔ مگر علاوہ اس معنی کے اور بھی بہت سے معنوں میں یہ لفظ آتا ہے اس کے ایک معنی وقت بھی ہیں۔ (ل) گویا وہ ایک امت یا جماعت کے رہنے کا زمانہ ہے۔ (ج) یہی معنی یہاں ہیں اور بعض نے ﴿اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ﴾ سے مراد لوگوں کی جماعت ہی لی ہے یعنی اس جماعت سے پیچھے ہٹا کر دوسری جماعت تک اسے ملتوی کر دیں۔ مگر معاندین کو چھوڑ کر

وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت چکھائیں پھر اسے اس سے لے لیں تو وہ ناامید ناشکر گزار ہو جاتا ہے۔

وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ۙ

اور اگر دکھ کے بعد جو اسے پہنچا ہو ہم اسے سکھ چکھائیں تو کہتا ہے کہ سب تکلیفیں مجھ سے جاتی رہیں یقیناً وہ اترانے والا شیخی کرنے والا ہے۔(1446)

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱

مگر جو صبر کرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے حفاظت اور بڑا اجر ہے۔

دوسروں پر لانا یہ سنت اللہ نہیں۔

عذاب سے یہاں صریحاً عذاب دنیا ہی مراد ہے۔ بعض نے اسے جنگ بدر کا عذاب کہا ہے مگر آخر تک جو کچھ کفار کی حالت ہوئی وہ سب ہی مراد ہے۔

1446 - فَرِحٌ۔ فَرَحٌ وہ خوشی ہے جو لذت عاجلہ کی وجہ سے ہو یعنی جلد آنے جانے والی سے۔ اس لیے اس کا اکثر استعمال لذات بدنی میں ہے ﴿وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ [الحدید: 23:57] ''اور نہ اس پر اتراؤ جو تمہیں دیا ہے۔'' ﴿وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [الرعد: 26:13] ''اور لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو جاتے ہیں۔'' ﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ [المؤمن: 83:40] ''وہ اسی پر نازاں رہے جو ان کے پاس کچھ علم تھا۔'' اور فَرِحَ کے معنی اس طرح خوش ہونے والا۔ اور صرف دو جگہ پر فَرِحَ کی رخصت دی گئی ہے ﴿فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ [یونس: 58:10] ''ہاں اسی پر چاہئے کہ خوش ہوں۔'' ﴿وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [الروم: 4:30] ''اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔'' (غ) اور فَرِحَ بمعنی بَطِرَ یعنی حد سے زیادہ خوش ہوا اور تکبر کیا۔ یا اَشِرَ یعنی ڈینگ ماری بھی آتا ہے۔ (ل) فَخُوْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 656]۔

جسمانی دُکھ اور سکھ:

دنیا طلب انسان کی تھڑدلی کا ذکر کیا ہے۔ پہلی آیت میں یہ کہ ذرا سکھ کے بعد دکھ آتا ہے تو پھر چاروں طرف سے ناامید ہو بیٹھتا ہے اور پہلی نعمت کی بھی ناشکری کرتا ہے اور اس میں یہ کہ دکھ کے بعد سکھ ملتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس پر اتراتا ہے اور دوسروں پر فخر کرتا ہے اور یہ سمجھا یا ہے کہ دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں کے آنے پر نہ تو خدا کے فضل اور رحمت سے ناامید ہونا چاہیے اور نہ ان کے چلے جانے پر اترانا چاہیے۔ گویا دنیا کے مال اور آرام کو عارضی چیزیں سمجھے۔ یہ زندگی کی غرض نہیں اگلی

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ ﴿۱۲﴾

تو کیا تو اس کا کچھ حصہ جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے چھوڑ دے اور تیرا سینہ اس پر تنگ ہوگا کہ وہ کہتے ہیں اس پر خزانہ کیوں نہیں اترا یا اس کے ساتھ فرشتہ (کیوں نہیں) آیا، تو تُو ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ (1447)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

یا یہ کہتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بنایا ہے؟ کہہ پھر اس جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ اور اللہ (تعالیٰ) کے سوائے جسے بلا سکتے ہو بلا لو،

آیت میں بتایا کہ اخلاق انسانی میں اصل چیز صبر ہے اور زندگی کی غرض اعمال صالحہ سے پوری ہوتی ہے اور دنیا طلب کے مقابلہ پر اعمال صالحہ کرنے والوں کا ذکر کیا۔

1447 - ﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ﴾ لَعَلَّ یہاں ترقی کے لیے نہیں بلکہ تَبْعِیْد کے لیے ہے۔ یعنی یہ امر بعید ہے کہ تو ایسا کرے بالفاظ دیگر تو ایسا نہیں کرسکتا اور یا استفہام انکاری ہے اور بعض نے ترجی مراد لے کر یعنی شاید معنی لے کر یہ کہا ہے کہ یہ ترجی دوسرے لوگوں کی طرف ہے جو مخاطب ہیں یعنی کافر چاہتے ہیں یا ایسی آرزو رکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ تبلیغ کا کچھ حصہ چھوڑ دیں۔ (ر)

﴿ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ﴾ [دیکھو نمبر: 1358]۔ مراد یہاں مغموم ہونا ہے کیونکہ غم سے بھی سینہ میں تنگی پیدا ہوتی ہے۔

﴿كَنْزٌ﴾۔ مال کو جوڑتے چلے جانا اور اس کی حفاظت کرنا کَنْزٌ ہے ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ [التوبة: 34:9] ''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔'' اور اسم کے معنی مال عظیم یا خزانہ ہیں۔ (غ)

دنیا داروں کے خیالات دنیوی زندگی تک ہی محدود ہوتے ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ نبی یا مصلح اخلاق آئے تو وہ بھی خزانہ ساتھ لائے۔ حالانکہ اس کے آنے کی غرض یہ ہے کہ مال دنیا کو اپنا محبوب نہ بنائیں۔ پس مال دنیا کی محبت کو وہ کم کرنے آتا ہے۔ مسلمان بھی آج ایسا ہی مصلح چاہتے ہیں جو ان کو بہت سا دنیا کا مال دے دے۔ دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ فرشتہ ساتھ ہو گویا روحانیات کو بھی مادی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرشتے تو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتے تھے، مگر ان کے دیکھنے کے لیے دوسری آنکھیں چاہئیں۔ ایسے ایسے اعتراض سن کر نبی کریم ﷺ کے دل پر کیا کیا غم نہ گزرتا ہوگا۔ تو فرمایا کہ ان باتوں پر غم مت کرو کوئی ان باتوں کی وجہ سے تم نے وحی کو تو ترک کرنا ہی نہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

اگر تم سچے ہو۔ (1448)

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سو کیا تم فرمانبردار ہوتے ہو؟ (1449)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت ہی چاہتا ہے ہم انہیں ان کے عمل اسی (زندگی) میں پورے دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے اس (زندگی) میں کیا تھا کسی کام نہ آئے گا اور جو کچھ وہ کرتے تھے باطل ہے۔ (1450)

1448 - **قرآن افترائے انسان نہیں:** یہاں دس سورتوں کے مقابلہ میں لانے کی تحدی کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت سورہ یونس سے پہلے کی نازل شدہ ہے۔ کیونکہ سورہ یونس میں ایک سورت کے لانے کا مطالبہ ہے۔ اس سے پہلے بھی کل قرآن کی مثل لانے کا مطالبہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

1449 - یعنی اگر وہ لوگ جنہیں تم مدد کے لیے بلاؤ وہ تمہاری بات کو قبول نہ کریں یا اس کا جواب نہ دیں یعنی دس سورتیں قرآن شریف کی مثل نہ لاسکیں تو سمجھ لو کہ یہ بشر کی طاقت سے بالاتر بات ہے۔ ﴿اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ﴾ میں صاف بتادیا کہ **اس کے اندر مضامین ایسے کامل اور ایسی علم کی باتیں ہیں** جو بشر کے علم میں نہیں آسکتیں۔ تو اصل مطالبہ محض فصاحت لفظی کا نہیں بلکہ یہ کہ ایسی سورتیں لاؤ جن میں ایسا علم ہو۔

1450 - اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا ہے کہ جو شخص جس راہ پر اپنے آپ کو ڈالتا ہے اسی میں کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ دنیا کی زندگی کو غرض بنالیتے ہیں انہیں دنیا کی زندگی میں بہتیرا کچھ مل جاتا ہے مگر آخرت میں اور انجام کار یہ باتیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ حرص دنیا کو بڑھانے کا انجام آگ ہے۔ یہاں کے عمل وہاں حبط ہیں یعنی بے نتیجہ۔ اس سے **حبط اعمال** کے مفہوم کا بھی پتہ لگتا ہے۔ اس حیوانی زندگی میں آسائش کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ وہاں کچھ کام نہیں دے گا یہ ان اعمال کا حبط ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۫ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب سے کھلی دلیل رکھتا ہے اور اس کی طرف سے ایک گواہ اس پر عمل کرتا ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی۔ یہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی فرقوں میں سے اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا ٹھکانہ آگ ہے۔ سو تو اس میں کسی شک میں نہ رہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے۔ (1451)

1451- ﴿يَتْلُوْهُ﴾۔ تَلٰی کے معنی پیروی کی یا عمل کیا [دیکھو نمبر: 67، 153]۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں: [يَقْتَدِيْ بِهٖ وَيَعْمَلُ] (غ) اس کی پیروی کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے اور يَتْلُوْهُ میں ضمیر بلحاظ معنی بَيِّنَةٍ کی طرف جاتی ہے کیونکہ بَيِّنَةٍ سے مراد قرآن شریف ہے۔

اَحْزَاب۔ حِزْبٌ کی جمع ہے اور وہ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں شدت ہو۔ (غ) ﴿حِزْبُ الشَّيْطٰنِ﴾ [المجادلة: 19:58] ''شیطان کا گروہ۔'' ﴿حِزْبُ اللّٰهِ﴾ [المجادلة: 22:58] ''اللہ کا گروہ۔'' ﴿اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا﴾ [الكهف: 12:18] ''دونوں گروہوں میں سے کون اس مدت کی بہتر حفاظت کرنے والا ہے جو ٹھہرے رہے۔'' ﴿لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ [الأحزاب: 22:33] ''جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا۔''

بینہ قرآن ہے:

دنیا اور اس کی زینت کے طالب کے مقابل پر یہاں ایک دوسرے فریق کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد زندگی بہت بلند ہے۔ ﴿اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ عام ہے۔ جس سے مراد مومن ہے اور ﴿بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ قرآن کریم ہے۔ جس کو دوسری جگہ ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ [البقرة: 185:2] ''اور حق کو الگ کرنے کی کھلی دلیلیں ہیں۔'' فرمایا ہے اور ایک جگہ بَيِّنَةٌ کہا ہے ﴿حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ [البينة: 1:98] ''یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آئے۔'' جس سے مراد رسول اللہ ﷺ بھی ہو سکتے ہیں اور قرآن کریم بھی اور ہر نبی کے حق میں اس کی وحی بَيِّنَةٌ ہے۔ جیسا کہ آگے حضرت نوح علیہ السلام، صالح علیہ السلام کے ذکر میں آتا ہے اور ﴿شَاهِدٌ مِّنْهُ﴾ یا **اللہ کی طرف سے گواہ رسول اللہ ﷺ ہیں** جو اس قرآن کو پڑھتے اور اس پر عمل کر کے دکھاتے ہیں اور شَاهِدٌ اور شہید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبی ہی ہوتے ہیں اور يَتْلُوْهُ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اس قرآن کو پڑھتا ہے یا اس قرآن پر عمل کرتا ہے اور دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں کیونکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کے

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۸﴾

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ وہ اپنے رب کے سامنے لائے جائیں گے اور گواہ کہیں گے یہی ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ (1452)

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو اللہ (تعالیٰ) کی راہ سے روکتے اور اس کے لیے کجی چاہتے ہیں اور وہ آخرت سے بھی منکر ہیں۔

ہاتھ میں صرف ایک بَيِّنَةٌ یعنی کتاب یا روشنی ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک کامل نمونہ بھی موجود ہے جو اس بَيِّنَةٌ پر عمل کر کے اس کے رستہ کو بالکل صاف کر دیتا اور اس میں بھی اس کتاب پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ تو کہاں وہ دنیا طلب انسان جس کی ہمت کی غایت دنیا کا مال اور اس کی زینت ہے اور کہاں یہ حق پرست انسان۔ اسی مقابلہ کو ظاہر کرنے کے لیے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا: ﴿مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ﴾ ''ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور دیکھنے والا اور سننے والا۔'' [24]

اور یہ جو فرمایا: ﴿وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً﴾ یعنی اس سے پہلے **حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب** کی پیروی کی جاتی تھی اور وہ رحمت تھی تو اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اسی طرح پر کتابوں کو نازل کرنا اور انبیاء کو ان کتابوں کی تعلیم عملی کا نمونہ بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے سنت رہی ہے تا کہ لوگ دنیا کو اپنی زندگی کی غرض و غایت نہ بنائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آگے جن انبیاء کا ذکر آتا ہے وہ سب اپنی امتوں سے یہی خطاب کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ایک بَيِّنَةٌ پر ہیں اور رحمت کے پرتو ہیں۔ کیونکہ **ہر نبی کی وحی اس کے حق میں بَيِّنَةٌ ہی ہے**۔ مگر اس میں ایک دوسری غرض یہ بھی ہے کہ یہ بَيِّنَةٌ (یعنی قرآن) ایسی صاف ہے کہ اس کی شہادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور پہلی کتابوں میں بھی ہے۔

1452 - اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر جھوٹ افترا کرنے والے اعدائے حق ہوتے ہیں۔ اشہاد سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ﴾ [النسآء: 41:4] ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے۔'' اور ان کا افترا دو طرح پر ہے۔ ایک افترا کر کے لوگوں کو حق سے روکتے ہیں دوسرے دین حق میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت کر دی۔

أُولَٰٓئِكَ لَمْ يَكُونُوا۟ مُعْجِزِينَ فِى ٱلْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ۘ يُضَٰعَفُ لَهُمُ ٱلْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا۟ يَسْتَطِيعُونَ ٱلسَّمْعَ وَمَا كَانُوا۟ يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾

وقف لازم

وہ زمین میں (خدا کو) عاجز کرنے والے نہیں اور نہ ان کے لیے سوائے اللہ کے کوئی مددگار ہوں گے ان کے لیے دگنا عذاب ہے۔ وہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ (1453)

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا اور ان سے گم ہوگیا جو وہ جھوٹ بناتے تھے۔

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ هُمُ ٱلْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾

ضرور ہے کہ وہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَأَخْبَتُوٓا۟ إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٣﴾

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور اپنے رب کے آگے عاجزی کرتے ہیں وہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ (1454)

مَثَلُ ٱلْفَرِيقَيْنِ كَٱلْأَعْمَىٰ وَٱلْأَصَمِّ وَٱلْبَصِيرِ وَٱلسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ

ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور دیکھنے والا اور سننے والا۔ کیا دونوں کی حالت یکساں

1453 - ﴿مَا كَانُوا۟ يَسْتَطِيعُونَ ٱلسَّمْعَ﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے یہ معنی مروی ہیں کہ وہ حق کو نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ ایسے طریق پر جس سے ان کو فائدہ ہوتا اور ہدایت پاتے۔ اس لیے کہ وہ کفر میں مشغول رہتے تھے۔ (ج) اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص دن رات ایک بات کی مخالفت میں لگا رہے تو اس میں حق بات کے سننے کی بھی تاب باقی نہیں رہتی اور یہی یہاں مراد ہے۔

1454 - ﴿أَخْبَتُوٓا۟﴾۔ خَبَتٌ پست زمین کو کہتے ہیں اس لیے إِخْبَات کے معنی نرمی اور تواضع اختیار کرنا ہیں۔ اور مُخْبِتٌ نرمی اختیار کرنے والا یا جھک جانے والا ہے ﴿وَبَشِّرِ ٱلْمُخْبِتِينَ﴾ [الحج: 34:22] ''اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری دے۔'' (غ)

ع 2 16 2

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۱﴾

ہے؟ تو کیا پھر تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔ (1455)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۫ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ۙ

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تمہیں کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾

کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

تو اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ ہم تجھے اپنے ہی جیسا انسان دیکھتے ہیں اور ہم نہیں دیکھتے کہ تیری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں نے جو ہم میں سے نیچ ہیں (اور وہ بھی) سرسری نظر سے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی بڑائی نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ (1456)

1455 - **دنیا طلب اور حق طلب کا مقابلہ:** یہاں دنیا طلب دنیوی زندگی کو اپنی غرض بنا لینے والے اور اس شخص کا جو زندگی کی اصل غرض و غایت کو سمجھ چکا ہے کھلے لفظوں میں مقابلہ کیا ہے۔ ایک کی مثال اندھے اور بہرے کی ہے کیونکہ وہ اصل غرض زندگی سے اندھا ہے اور دوسرے کی مثال بصیر و سمیع کی ہے۔

1456 - ﴿اَرَاذِلُ﴾۔ اَرْذَلَ کی جمع ہے اور رَذْلٌ اور رَذِیْلٌ اور اَرْذَلَ کمینہ اور خسیس شخص کو کہتے ہیں اور ہر چیز میں سے جو ردی ہو اس پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ل) ﴿وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ [النحل: 70:16] ''اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو نہایت ہی خراب عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔'' ﴿وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ [الشعرآء: 111:26] ''اور تیرے پیرو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔''

﴿بَادِیَ الرَّاْیِ﴾ بَدَا کے معنی ظاہر ہوا اور بَدْءٌ کے معنی شروع کیا اور بادی دونوں سے ہو سکتا ہے کیونکہ ہمزہ یا سے بدل جاتا ہے۔ صورت اول میں ﴿بَادِیَ الرَّاْیِ﴾ کے معنی ہوں گے سرسری نظر سے۔ صورت ثانی میں پہلی نظر میں۔ ماحصل ایک ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا اتباع جن لوگوں نے کیا ہے انہوں نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔

سب سے پہلا اعتراض انبیاء پر یہی ہوتا ہے کہ یہ ہماری طرح بشر ہیں۔ کھانے پینے اور حوائج بشری کے محتاج ہیں۔ حالانکہ بشر ہی بشر کے لیے رہنما اور ہادی کا کام دے سکتا ہے۔ جو شخص حوائج بشری کا محتاج نہیں وہ بشر کے لیے نمونہ کا کام کیونکر دے سکتا

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے اپنے پاس سے مجھے رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مشتبہ رہ گئی! کیا ہم اسے تمہیں لگا دیں حالانکہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو۔ (1457)

ہے۔ اگر خالی تعلیم انسانوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہوتی اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ ہوتی تو بلاشبہ ہوسکتا تھا کہ یہ تعلیم بذریعہ ملک یا کسی اور ذریعہ سے بغیر وسیلہ بشر کے انسانوں کو پہنچادی جاتی۔ مگر چونکہ جس طرح تعلیم کی ضرورت ہے اسی طرح نمونہ کی ضرورت ہے اور بغیر نمونہ کے تعلیم عبث ہے اور نمونہ بشر کے لیے بشر ہی ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ اعتراض کم فہمی سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ **نبی کے پیرو شروع میں غریب لوگ ہوتے ہیں**۔ امراء جو نشہ دولت اور حکومت میں مست ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کہاں رجوع کرتے ہیں اور انہی کو یہاں ارازل کہا ہے۔ گویا دولت و مرتبہ دنیوی کو وہ لوگ شرف اور بزرگی کا معیار قرار دیتے ہیں اور مزدوری کر کے کمانے اور کھانے والے ان کو رذیل نظر آتے ہیں۔ حجام ہو یا دھوبی یا مزدور۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک **مزدوری اور محنت ہی شرف انسانیت ہے**۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ لوگ جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ تھے حجام اور موچی تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام خود بلحاظ پیشہ بڑھئی تھے۔ آپ کے حواری ماہی گیر اور دھوبی تھے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ چھوٹوں کو نبی کی تعلیم سے بلند مقامات پر پہنچاتا ہے اور سرکشوں، متکبروں کو جو حق کی مخالفت کرتے ہیں نیچا دکھاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور محنت:

دنیا نے محنت اور مزدوری کی قدر کو نہیں سمجھا۔ قرآن کریم نے اس پر بہت زور دیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی اس تعلیم کا عملی نمونہ یوں بن کر دکھایا کہ ہر قسم کے کام یہاں تک کہ ٹوکری اٹھالینا، پھاوڑا چلالینا، بکریوں کو دوہ لینا، اپنے کپڑے، جوتی وغیرہ کی مرمت کرلینا سب کام اپنے ہاتھ سے کیے تا دنیا کو یہ معلوم ہو کہ ہر قسم کی محنت و مزدوری قابل عزت شے ہے۔ جن لوگوں نے اس پاک اصول سے روگردانی کی ہے ان کے لیے بولشوزم کی صورت میں سزا پیدا کردی گئی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ تم کو یعنی نبی اور اس کے متبعین کو ہم پر کوئی فضیلت نہیں۔ اس سے بھی مراد دنیوی طور پر فضیلت اور مرتبہ ہے۔ حالانکہ **اصل فضیلت** وہ ہے جو اخلاق اور روحانیت سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے سامنے دنیا کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ وہ تہذیب کے مدعی جو آج ایشیا کے باشندوں کو ارازل کی طرح سمجھتے ہیں اپنی گردنیں ایک ایشیائی (بلحاظ پیشہ) نجار کے سامنے جھکاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے خدا بناتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اصل حکومت دنیا میں اخلاق اور روحانیت کی ہے۔

1457- ﴿عُمِّيَتْ﴾۔ [عَمّٰى بَصَرْ] یعنی آنکھ اور بصیرت یعنی رائے کی روشنی کا جاتے رہنا ہے اور دونوں معنی میں قرآن شریف میں بکثرت اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے ﴿جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ [عبس: 2:80] ''اس کے پاس اندھا آیا'' پہلے معنی

وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

اور اے میری قوم میں اس کے بدلے تم سے مال نہیں مانگتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور میں انہیں نکال نہیں سکتا جو ایمان لائے ہیں وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں لیکن میں تمہیں ایسی قوم دیکھتا ہوں جو جاہل ہو۔ (1458)

میں ہے ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ [البقرة: 18:2] ''بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔'' ﴿فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا﴾ [المآئدة: 71:5] ''سو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔'' دوسرے معنی میں ہے اور دونوں معنوں کو ﴿لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى﴾ [الحج: 46:22] ''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں۔'' میں اکٹھا کر دیا ہے۔ [عَمِيَ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں اس پر وہ بات مشتبہ ہو گئی گویا اس کی نسبت وہ اَعْمٰی کے حکم میں ہے۔ اسی معنی میں یہاں ہے اور عَمَاءٌ بادل اور جہالت کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا عَمَاءٍ میں ہونا: اور حدیث میں جو آتا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا تو آپ نے فرمایا: [كَانَ فِيْ عَمَاءٍ تَحْتِهِ هَوَاءٌ وَفَوْقُهُ هَوَاءٌ] (كنزالعمال فی سنن الأقوال، جلد10، صفحہ370، ؛29851) تو یہ اشارہ ہے ایسی حالت کی طرف جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے اور وہ اس پر واقف نہیں ہو سکتا۔ (غ)

نَلْزِمُ۔ لُزُوْمٌ کسی چیز کا بہت لمبے زمانہ تک ٹھہرنا ہے۔ (گویا وہ دوسری چیز سے لگ گئی) ﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾ [الفرقان: 77:25] ''پس (اس کی سزا) تمہارے لازم حال ہو گی۔'' یعنی لازم ہو جائے گا یا ساتھ لگ جائے گا۔ ﴿وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ [الفتح: 26:48] ''اور انہیں تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا۔'' (غ)

شروع سورت میں طالب دنیا اور طالب حق کا مقابلہ جس رنگ میں دکھایا تھا کہ ایک دنیا کی زندگی اور اس کے سامان کو ہی اپنا مقصد بنا لیتا ہے اور دوسرا اپنے رب سے بینہ پر ہوتا ہے۔ اسی کی مثال اب سب انبیاء میں دی ہے اور بتایا ہے کہ وہی بات جو نبی اور اس کے پیروؤں کے لیے روشن دلیل ہے ان کے منکرین کو تاریک اور مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں پر طرح طرح کے پردے مال دنیا کی محبت کے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ دلوں پر زنگ کی وجہ سے اس روشنی کو نہیں دیکھ سکتے جو ایک صاف دل انسان کو نظر آتی ہے۔ ان کی فطرت کے آئینہ پر زنگ لگ چکا ہوتا ہے اور مومن کی فطرت کا آئینہ صاف ہوتا ہے۔

1458 - تمام انبیائے عالم کی ایک ہی شان نظر آتی ہے کہ دنیا کے مال کی ان کے دلوں میں کچھ عظمت نہیں ہوتی اور نہ ہی جو محنت اور خدمت قوم کی یا نسل انسانی کی وہ کرتے ہیں اس کا کوئی معاوضہ لیتے ہیں۔ ایک نمایاں شان ان کی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایثار اور **بے نفسی کا کامل ترین نمونہ** انسانوں کے لیے ہوتے ہیں۔ جو کچھ مال ان کے ہاتھ میں ہو وہ بھی مخلوق خدا کی خدمت میں صرف

وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

اور اے میری قوم کون اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کرسکتا ہے اگر میں انہیں نکال دوں تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔

وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۖۚ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

اور میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ جنہیں تمہاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں اللہ ان کو بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ (ایسا کروں) تو بے شک میں ظالموں میں سے ہوں گا۔ (1459)

کر دیتے ہیں اور مال کمانے کی ان کو قطعاً کوئی فکر نہیں ہوتی۔ یہ نمونہ بھی اپنے کمال میں محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی نظر آتا ہے اور درحقیقت تمام انبیاء کے تذکرہ میں اصل غرض محمد رسول اللہ ﷺ کے مقام بلند کی طرف توجہ دلانا ہے جس سے مخاطب روشنی حاصل کر سکتے تھے۔ ہاں سبھی انبیاء کا نمونہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مال نہیں چاہتے اور نہ دنیاداروں اور صاحبان مال و دولت سے انہیں کچھ انس ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے تعلقات انہی لوگوں سے ہوتے ہیں جو اخلاق اور روحانیت کو مدنظر رکھتے ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ملنے والے ہیں یعنی مال دنیا کی جگہ اللہ تعالیٰ کے لقا کو اپنی زندگیوں کا مقصد اور منتہا ٹھہراتے ہیں وہی اس بات کے اہل ہیں کہ نبی کے پاس رہیں۔ دنیاداروں کی خاطر ان لوگوں کو نبی کس طرح جواب دے سکتا ہے۔

1459 - ﴿تَزْدَرِيْۤ﴾۔ اس کا اصل زَرِیٌ ہے اور [زَرَيْتُ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں میں نے اس پر عیب لگایا۔ اور اِزْدِرَاءٌ اس سے باب افتعال ہے جس کی تا دال سے بدل گئی ہے اور ﴿تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ﴾ کے معنی ہیں تمہاری آنکھیں ان پر عیب لگاتی یا انہیں حقیر قرار دیتی ہیں۔ یا وہ تمہیں حقیر معلوم ہوتے ہیں۔

دعوت انبیاء کا دنیوی مال وجاہ کے لالچ سے برتر ہونا:

یہ باتیں اس لیے کہی جاتی ہیں کہ کسی قسم کے دنیوی لالچ کو مدنظر رکھ کر کوئی شخص اس تعلیم کو قبول نہ کرے۔ رسول کے قبضے میں مال وخزانے نہیں ہوتے کہ اپنے متبعین کو مالا مال کر دے۔ نہ وہ غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کو غیب دانی سے تکلیف سے بچالے۔ نہ وہ خود ملک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ آپ ہی حوائج بشری سے پاک ہو۔ ہاں جنہیں دنیا کے لوگ

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

انہوں نے کہا اے نوح! تو ہم سے جھگڑا اور ہم سے بہتیرا جھگڑ چکا، تُو جس کا وعدہ دیتا ہے وہ لے آ۔ اگر تو سچوں میں سے ہے۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا اس کو اللہ ہی لے آئے گا جب وہ چاہے گا اور تم (اسے) عاجز نہیں کر سکتے۔

وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ ؕ

اور تمہیں میری نصیحت نفع نہیں دے سکتی اگر میں چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ کا ارادہ ہو چکا ہو کہ وہ تمہیں ہلاک کرے وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ (1460)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع 3 11 3

کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ بنا لیا ہے۔ کہہ اگر میں نے یہ جھوٹ بنایا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم گناہ کرتے ہو۔ (1461)

حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس بہت مال نہیں یا وہ بڑے مرتبہ پر نہیں ان کے متعلق وہ بھلائی کا امیدوار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو دیکھ کر اس کے مطابق ان کو اجر دیتا ہے۔

1460 - ﴿يُغْوِيَكُمْ﴾ اس کے لیے [دیکھو نمبر: 1058]۔ انسان کی خیر خواہی دوسرے کے کام نہیں آ سکتی جب وہ خود غلط راہ پر قدم مارتا ہوا اتنی دور نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ اس پر گمراہ ہونے کا یا ہلاکت کا حکم لگا دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اسی وقت لگاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص اپنی اصلاح کسی صورت میں نہیں کرتا۔

1461 - اِجْرَامٌ۔ جَرَمٌ کے معنی قَطَعَ یعنی کاٹ دینا ہیں درخت کے کاٹنے پر بولا جاتا ہے اور [شَجَرَةٌ جَرِيْمَةٌ] کٹے ہوئے درخت کو کہتے ہیں اور اَجْرَمَ کے معنی ہیں [حَانَ جَرَامُهُ] یعنی اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا۔ اور جُرْمٌ گناہ کو کہتے ہیں۔ (ل) اور مادہ کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرم وہ گناہ ہے جو قطع کر دیتا ہے یعنی ایسا سخت گناہ جو اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم سے کوئی ایمان نہیں لائے گا مگر وہی جو ایمان لا چکا۔ سو تو اس پر غم نہ کر جو وہ کرتے ہیں۔(1462)

وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا اور ان کے بارے میں مجھے کچھ نہ کہہ جو ظالم ہیں وہ غرق کیے جائیں گے۔(1463)

کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں اجرام اور مجرم سخت گناہوں پر بولا گیا ہے۔ اس جگہ اِجْرَامِیْ سے مراد اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے کا گناہ اور تُجْرِمُوْنَ سے مراد مخالفین حق کے وہ گناہ ہیں جو وہ حق کو نیست و نابود کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس آیت میں خطاب کو بدل دیا ہے اور ذکر آنحضرت ﷺ کے مخالفین کا ہے۔

1462 - ﴿تَبْتَىِٕسْ﴾ ۔ اس کا اصل بُؤْس یا بَأْس ہے جس کے معنی شدت و مکروہ ہیں اور اس کے معنی: [لَا تَلْتَزِمُ الْبُؤْسَ وَلَا تَحْزَنْ بُؤْسَ] کہ لازم نہ کر اور غم نہ کر۔ (غ)

حضرت نوح علیہ السلام کو قوم کی سخت دلی دیکھ کر سخت غم ہوتا تھا اور سبھی انبیاء علیہم السلام کو ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 3:26] ''شاید تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔'' ان حالات میں اطلاع دی ہے کہ یہ قوم اب ہلاکت کے قابل ہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ﴿لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝﴾ [نوح: 26:71] ''زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیو۔'' اس وحی کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے۔

1463 - ﴿بِاَعْيُنِنَا﴾ ۔ عَيْنٌ آنکھ ہے۔ لیکن جو شخص کسی کی حفاظت کرے اسے بھی عین کہہ دیا جاتا ہے اور [فُلَانٌ بِعَيْنِي] کے معنی ہیں اس کی حفاظت اور نگہداشت کرتا ہوں اور [عَيْنَ اللّٰهِ عَلَيْكَ] کے معنی ہیں تم اللہ کی حفاظت اور اس کی حمایت میں رہو۔ اسی سے یہ محاورہ ہے۔ دوسری جگہ ہے ﴿تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا﴾ [القمر: 14:54] یعنی کشتی ہماری حفاظت میں چلتی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے ﴿وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ [طٰہٰ: 39:20] یعنی میری حفاظت میں پرورش پائے۔ (غ)

﴿تُخَاطِبْنِيْ﴾ ۔ خَطَبَ اور مُخَاطِبَةُ بات کا ایک دوسرے کی طرف لوٹانا ہے۔ (غ) اور اللہ تعالیٰ سے مخاطبت یہ ہے کہ اس کا حکم سن لینے کے بعد ایک قوم ہلاک کی جائے گی پھر اس کی سفارش کی جائے۔

چونکہ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے سیلاب سے تباہ کرنا تھا اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کو پہلے سے کشتی بنانے کا حکم دیا۔ پس یہ کشتی وحی الٰہی کے مطابق بنی اور اپنی حفاظت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ دشمن بہت تھے۔ پس تسلی دی کہ وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب اس قوم کے سردار اس پر گزرتے ہیں اس پر ہنستے ہیں۔ کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنستے ہیں جیسے تم (ہم پر) ہنستے ہو۔ (1464)

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

سو تم جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور کس پر قائم رہنے والا عذاب اترتا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور وادی نے جوش مارا۔ ہم نے کہا اس میں ہر (ضرورت کی) شے کے نر و مادہ دو دو لے لو اور اپنے اہل کو مگر جس کے متعلق پہلے حکم ہو چکا اور ان کو بھی جو ایمان لائے اور اس کے ساتھ تھوڑے ہی ایمان لائے تھے۔ (1465)

1464 - ﴿سَخَرُ مِنْكُمْ﴾ **حضرت نوح علیہ السلام یا مومنوں کا واقعی ہنسی کرنا مراد نہیں** اس لیے کہ استہزا مومن کی شان نہیں۔ یہ محض ان کے فعل کے مقابل پر ذکر ہے۔ جیسے ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: 40:42] ''بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔'' اور کشاف نے اس کے معنی استہزال لیے ہیں کیونکہ استہزا کا اصل سبب جہالت ہے تو سُخْرِيَّةٌ سے مراد اس کا سبب لیا ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی جہالت کی وجہ سے ہم پر ہنستے ہو مگر ہم تمہیں جاہل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اصل حقیقت کی تمہیں خبر نہیں۔

1465 - فَارَ کے معنی ہیں جَاشَ یعنی جوش میں آیا۔ ہانڈی کے ابال پر، آدمی کے غضب میں آنے پر، مشک کے پھیل جانے پر فَارَ بولا جاتا ہے اور پانی جب پھوٹ پر چشمہ سے نکلے تو اس پر بھی فَارَ بولا جاتا ہے: [فَارَ الْمَاءِ مِنَ الْعَيْنِ] اور فَوَّارَةٌ وہ جگہ ہے جہاں سے پانی پھوٹ کر نکلے۔ [مَنْبَعُ الْمَاءُ] اور پانی کے حوض کو بھی فَوَّارَةٌ کہا جاتا ہے۔ (ت)

تَنُّوْرُ کو بعض نے فارسی سے معرب کیا ہے اور بعض نے اس کا مادہ نور یا نار قرار دیا ہے۔ اور تنور کے ایک معنی تو مشہور ہیں جس میں ہماری زبان میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے یعنی جہاں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اس کے دوسرے معنی جو تاج العروس میں دیئے ہیں [وَجْهُ الْاَرْضِ] یعنی سطح زمین ہیں اور یہ معنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ اور پھر لکھا ہے: [كُلُّ مَفْجَرِ مَاءٍ تَنُّوْرٌ] یعنی ہر ایک پانی پھوٹ نکلنے کی جگہ کو تنور کہا جاتا ہے۔ [مَحْفِلُ مَاءُ الْوَادِيْ] یعنی وادی کے پانی کے اکٹھا ہونے کی جگہ کو بھی تنور کہتے ہیں اور قتادہ سے ہے کہ بلند اور اشرف زمین کو تنور کہا جاتا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایک یہ معنی

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے

بھی مروی ہیں کہ ﴿فَارَ التَّنُّوْرُ﴾ سے مراد یہاں صبح کا پھوٹ نکلنا ہیں اور ہروی کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ایک پانی کا مشہور چشمہ ہے۔(ت)

یہاں اس سیلاب کے آنے کا ذکر ہے جو **طوفان نوح** کے نام سے مشہور ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ اس کی ابتدا یوں ہوئی تھی کہ ایک تنور سے پانی پھوٹ نکلا تھا۔ لیکن قرآن شریف نے خود دوسری جگہ یوں فرمایا ﴿فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ﴾ [القمر: 11:54] ''پس ہم نے بادل کے دروازے زور سے برستے ہوئے پانی سے کھول دیئے۔'' یعنی اوپر سے بہت پانی برسا اور خود یہاں جب طوفان کو ٹھہرانے کا وقت آتا ہے تو حکم ہوتا ہے ﴿يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ﴾ [44] اے بادل تھم جا۔ جس سے معلوم ہوا کہ بادلوں سے پانی برسنا شروع ہوا تھا اور یہ جو زمین کے اسی آیت میں پانی جذب کر لینے کا حکم ہے تو ظاہر ہے کہ پانی زمین میں ہی جذب ہو کر اوپر سے خشک ہوتا ہے۔

فَارَ التَّنُّوْرُ سے مراد:

تنور کے لفظ سے یہ غلط استدلال کیا گیا ہے کہ پہلے تنور سے پانی پھوٹ کر نکلا۔ تنور کے معنی بروئے لغت اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ابن جریر نے جو اقوال بیان کیے ہیں ان میں

① اول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ تنور کے معنی [وَجْهُ الْاَرْضُ] ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا تھا [اِذَا رَاَيْتَ الْمَاءُ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ فَارْكَبْ] اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: [اَلْعَرَبُ تُسَمِّيْ وَجْهُ الْاَرْضِ تَنُّوْرُ الْاَرْضِ.]

② دوسرا قول سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا منقول ہے کہ اس سے مراد [تَنْوِيْرُ الصُّبْحِ] یعنی صبح کی روشنی ہے۔

③ تیسرا قول قتادہ کا منقول ہے کہ اس سے مراد بلند اور اشرف زمین ہے۔

④ اور چوتھا قول روٹی کے تنور سے پانی نکلنے کا ہے۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو پے در پے بارش شروع ہوئی۔ نہ آسمان کھلتا تھا نہ بارش بند ہوتی تھی۔ اور اس کی تائید میں انہوں نے آیت ﴿فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ﴾ [القمر: 11:54] ''پس ہم نے بادل کے دروازے زور سے برستے ہوئے پانی سے کھول دیئے۔'' نقل کی ہے۔ اور پھر فَارَ التَّنُّوْرُ کی تفسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کر کے لکھا ہے: [اَیْ صَارَتِ الْاَرْضُ عُيُوْنًا تَفُوْرُ حَتّٰى فَارَالْمَاءُ مِنَ التَّنَانِيْرِ] یعنی ساری زمین پر پانی ہی پانی بہ نکلا یہاں تک کہ تنوروں سے بھی پانی بہ نکلا۔ پس قرآن کریم سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ کثرت بارش سے اتنا بڑا سیلاب آیا جس میں قوم نوح کی ساری بستیاں بہہ گئیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بستیوں کے اوپر پہاڑ بھی تھے جیسا کہ ﴿سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ﴾ سے ظاہر ہے۔ اور پہاڑوں کی بارش سے وادی میں پانی کا زور اور بھی زیادہ ہو گیا۔

مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ اس کا چلنا اور اس کا لنگر ڈالنا ہے۔ یقیناً میرا رب

قرأ حفص بفتح الميم وامالة الراء ۱۲

حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں کیا کیا لیا:

اور یہ جو فرمایا کہ ہر شے کے زوجین لے لو تو ہر شے سے مراد یہ نہیں کہ تمام روئے زمین پر پھر کر جانوروں کو اکٹھا کرو۔ ایسا کام ایک نبی کے سپرد کرنا بے معنی بات ہے کہ وہ ساری زمین میں پھر کر ہر قسم کے جانداروں کے نر و مادہ لیتا پھرے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر انسان حاوی کہاں ہوسکتا ہے۔ اور یہ فرض کر لینا کہ ایک ایک جوڑے کو خود اللہ تعالیٰ نے وحی کر دی کہ وہ زمین کے تمام گوشوں سے بھاگ کر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جمع ہو گئے اور باقی اسی نوع کے جانوروں کو وحی نہ کی۔ تو طوفان کے آنے سے پہلے اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر درند، چرند، پرند درخت سب حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جمع ہوئے تھے لوگ کیوں ایمان نہ لے آتے۔ یہ تمام بے ضرورت اور بے سند باتیں ہیں جو غلطی سے تراشی ہوئی ہیں۔ كُلٍّ سے مراد یہاں اپنی ضرورت کی شے ہے۔ جیسا جب توریت کو ﴿ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [يوسف: 111:12] ''ہر چیز کی تفصیل ہے۔'' کہا تو مراد اس سے اس وقت کی ضرورت ہے یا ایک ملکہ کے متعلق کہا ﴿ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل: 23:27] ''اسے ہر چیز دی گئی ہے۔'' تو مراد تمام عالم کی اشیاء نہیں بلکہ اس کی اپنی ضرورت کی اشیاء ہیں، اسی طرح یہاں ہے۔ اور زوج چونکہ جوڑے کے ہر فرد کو کہا جاتا ہے اس لیے زوجین سے مراد ایک نر اور ایک مادہ ہے اور اثْنَيْنِ میں اسی کی تفصیل ہے۔ اور بعض نے لفظ كُلٍّ کو وسیع کر کے اور پھر اس خیال کے نیچے کہ یہ طوفان کل روئے زمین پر محیط تھا، نہ صرف درند و پرند کا ساتھ لینا بیان کیا ہے بلکہ درختوں کے مختلف اقسام کا ساتھ لینا بھی فرض کر لیا ہے۔ اور پھر اس پر عجیب عجیب قسم کی کہانیاں بنائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ چوہوں نے جب کشتی کے رسوں کو کاٹنا شروع کیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی تو شیر کی چھینک سے بلیاں پیدا ہو گئیں۔ اور ایسا ہی جب غلاظت بڑھ گئی تو ہاتھی کے چھینکنے سے سور پیدا ہو گئے اور شیر سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیر کو تپ چڑھا دیا۔ ایسے ہی اور بہت سے فضول قصے جمع کر دیئے گئے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ مثلاً یہ کہ شیطان بھی گدھے کی دم پکڑ کر چڑھ گیا تھا۔ قرآن و حدیث ان تمام لغویات سے پاک ہیں۔

طوفان نوح کل روئے زمین پر نہ تھا:

یہ ساری مصیبتیں اس لیے پیش آئیں کہ بائبل کے بیان کو صحیح سمجھ کر یہ فرض کر لیا گیا کہ طوفان کل روئے زمین پر آیا تھا۔ حالانکہ قرآن شریف صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ قوم نوح کے لیے آیا تھا۔ قرآن شریف نے کہیں نہیں فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو کل دنیا کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بلکہ بار بار یہی کہا کہ ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا اور پھر یہی فرمایا کہ مکذبوں کو غرق کیا گیا اور ابھی اوپر آ چکا ہے ﴿ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ ﴾ یہاں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے نہ کل عالم کا اور اَلْاَرْضِ کا لفظ عام ہے۔ کسی حصہ ارض پر یا کسی ملک پر بھی بولا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کل دنیا پر آباد نہ تھی بلکہ خاص قطعہ زمین میں تھی نہ ایک اکیلا آدمی کل روئے زمین پر پھر سکتا تھا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اللہ تعالیٰ نے کل عالم کی طرف مبعوث کیا تو آپ کی تبلیغ بھی بذریعہ آپ کے متبعین کے آہستہ آہستہ دنیا میں پہنچنی مقدر ہوئی۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کل روئے

لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(1466)

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۚ وَ نَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور انہیں پہاڑ جیسی لہروں میں لیے چلی جارہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ الگ ہورہا تھا۔ اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور کافروں کے ساتھ مت ہو۔(1467)

قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

اس نے کہا میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچالے۔ کہا آج کی سزا سے کوئی بچانے والا نہیں مگر وہی (بچے گا) جس پر وہ رحم کرے۔ اور ایک لہر ان کے درمیان حائل ہوئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہوگیا۔

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا

اور کہا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کرلے اور اے بادل تھم جا اور پانی خشک ہوگیا اور کام کا فیصلہ ہوگیا اور (کشتی) جودی پر ٹھہر گئی، اور کہا گیا

زمین پر ایک ہی شخص ایک دفعہ پھر نکلے اور اس کی تکذیب پر فوراً ساری دنیا ہلاک ہوجائے تو یہ آنحضرت ﷺ کے لیے ہونا چاہیے تھا نہ حضرت نوح علیہ السلام کے لیے جو صرف ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ بھی ان مقامات میں سے ایک ہے جہاں قرآن کریم نے بائبل کی غلطی کی اصلاح کی ہے۔

1466 - مَجْرٖىهَا۔ یہاں یا مجہول کی آواز سے پڑھا جاتا ہے یعنی مجرے۔ اور اس کا اصل جَرِیَ ہے جس کے معنی ہیں تیزی سے گزرنا جیسے پانی۔ ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ [آل عمران: 195:3] ''جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔'' ﴿فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾ [الغاشية: 12:88] ''اس میں بہتا ہوا چشمہ ہے۔'' اور کشتی کے چلنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ) کشتی کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے یعنی اس کی اعانت یا اس کی قدرت یا اس کے امر اور اذن سے۔

1467 - ﴿مَعْزِلٍ﴾۔ عَزَلَ کے معنی علیحدہ ہونا اور ﴿كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے علیحدہ تھا یعنی مومنوں میں سے نہ تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے چاہا کہ اب بھی ایمان لے آئے۔ یا مراد یہ ہے کہ کشتی سے دور تھا۔

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

ظالم قوم کے لیے دوری ہے۔(1468)

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے میرے رب میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

کہا اے نوح! وہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بدعمل ہے۔ سو مجھ سے ایسا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو ناواقفوں میں سے نہ ہو۔(1469)

1468 - ﴿اَبْلَعِيْ﴾۔ بَلِعَ کے معنی ہیں جَرَعَ یعنی گھونٹ گھونٹ کر کے یا تھوڑا تھوڑا کر کے نگل لیا۔ (ل) اور یہاں اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا کہ زمین بھی پانی کو آہستہ آہستہ جذب کرتی چلی جاتی ہے۔

اَقْلِعِيْ۔ قَلَعَ کے معنی ہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اَقلَعَ کے معنی کسی چیز سے رک گیا اور [اَقلَعَ السَّحَابُ] کے معنی ہیں بادل برسنے سے رک گیا۔ (ل)

﴿غِيْضَ﴾۔ غَاضَ کے معنی ہیں نَقَصَ ایک چیز کم ہوگئی یا دوسرے نے اسے کم کر دیا۔ ﴿مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ﴾ [الرعد: 8:13] یعنی رحم اسے خراب کر دیتے ہیں یا ان کی حالت ایسی کر دیتے ہیں جیسے زمین پانی کو نگل جاتی ہے۔

﴿جُوْدِيِّ﴾ [قِيْلَ هُوَ اِسْمُ جَبَلٍ بَيْنَ الْمُوْصِلِ وَالْجَزِيْرَةِ وَ هُوَ فِي الْاَصْلِ مَنْسُوْبٌ اِلَى الْجُوْدِ] (غ) یعنی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان ہے اور وہ اصل میں جودی یعنی بخشش کی طرف منسوب ہے۔

جب وہ بستیاں ہلاک ہو چکیں تو مینہ تھم گیا اور زمین نے پانی کو جذب کر لیا اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی۔ ابن جریر میں بعض روایات میں ہے: [شَمَخَتِ الْجِبَالُ وَ تَوَاضَعَ] جس کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ دوسرے پہاڑوں نے تکبر کیا اور جودی نے تواضع اختیار کی۔ مگر شَمَخَ کے اصل معنی بلند ہونا ہیں اور وضع کے معنی پست ہونا اور مراد صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے پہاڑ بلند تھے جو غرق نہیں ہوئے اور جودی پست تھا یعنی کوئی چھوٹا ٹیلا تھا جس پر کشتی آ لگی۔

1469 - ﴿اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ میں ضمیر سوال کی طرف نہیں بلکہ اس بیٹے کی طرف ہے اور مراد ہے [ذُوْ عَمَلٍ] یعنی وہ غیر صالح یا برے کام کرنے والا ہے جیسا ﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ﴾ [البقرة: 177:2] ''لیکن بڑا نیک وہ ہے جو ایمان لائے۔'' میں مراد

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ(۴۷)

کہا اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر تو میری حفاظت نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گا۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ(۴۸)

کہا گیا اے نوح ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اتر (جو) تجھ پر اور (کئی) جماعتوں پر (ہوں گی) جو تیرے ساتھ والوں سے ہوں اور ایسی امتیں (بھی ہوں گی) جنہیں ہم کچھ سامان دیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ (1470)

راستبازی نہیں بلکہ راستباز ہے۔ [دیکھو نمبر: 215]

نوح علیہ السلام کے بیٹے کا اہل میں سے نہ ہونا:

ان آیات میں ظاہر الفاظ کے لحاظ سے بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا نہ تھا۔ بلکہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا کسی پہلے خاوند سے بیٹا تھا۔ یہ فی الواقع صحیح ہو یا نہ ہو، یہاں یہ مراد نہیں۔ بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اہل کو جو بچانے کا وعدہ تھا تو حضرت نوح علیہ السلام نے ظاہر الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے عرض کیا کہ اہل میں تو وہ داخل تھا یعنی بلحاظ نسب۔ اس لیے وہ کیوں مطابق وعدہ نہ بچایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صالحین کے اہل صرف بلحاظ نسب نہیں ہوتے بلکہ بلحاظ عمل بھی۔ چونکہ وہ بدعمل ہے، برے کام کرتا ہے اس لیے وہ تمہارے اہل میں داخل نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ایسا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ دعا ایسے امور کے لیے کرنی چاہیے جن کے متعلق یہ علم ہو کہ ان کا حصول درست اور حکمت الٰہی کے مطابق ہے۔ ایک عورت یہ دعا کرے کہ میں مرد بن جاؤں تو یہ عبث ہے۔ کفار کے ایمان کے بارہ میں یا ان کی مغفرت کے لیے دعا اس وقت تک کی جاسکتی ہے جب تک کہ ان کے ایمان لانے کا موقع باقی ہے۔ جب وہ شخص حالت کفر میں غرق ہو گیا تو اس کے متعلق دعا بے سود تھی اس لیے اس سے روک دیا۔

1470 - ﴿اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ﴾ یعنی ایسی امتیں جو تیرے ساتھیوں میں سے بن جائیں گی۔ جس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ تھے ان میں سے بھی آگے قومیں بنیں۔ اور ﴿اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ﴾ میں بظاہر دوسری قوموں کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت دنیا میں موجود تھیں یا انہی کی نسل میں سے پیچھے آنے والی امتیں مراد ہیں۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع 4 14 4

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔ تو انہیں اس سے پہلے نہ جانتا تھا اور نہ تیری قوم، سو صبر کر انجام متقیوں کے لیے ہے۔ (1471)

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۛ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۛ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ تم صرف جھوٹ بنانے والے ہو۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۛ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۛ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

اے میری قوم میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر صرف اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اور اے میری قوم اپنے رب کی بخشش مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر زور سے برستا ہوا بادل بھیجے گا اور تمہاری طاقت کو بڑھا کر زیادہ طاقت کرے گا اور مجرم ہو کر پھر نہ جاؤ۔ (1472)

1471 - پچھلے رکوع کے آخر پر بھی انتقال مضمون آنحضرت ﷺ کے اعدا کی طرف کیا تھا یہاں بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ نوح علیہ السلام اور اس کے مخالفوں کا قصہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخالفوں کے لیے بطور پیشگوئی ہے اور یہی ﴿اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ﴾ ہیں جن کا یہاں ذکر ہے۔ جیسا کہ آخری الفاظ ﴿فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ سے ظاہر ہے۔

1472 - مینہ برسانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے افضال ہیں۔ اگر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور ظلم اور زیادتی سے رک جائے تو اللہ تعالیٰ کے افضال اس پر اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی قوت بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہے۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

انہوں نے کہا اے ہود تو ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل نہیں لایا اور ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ کو ماننے والے ہیں۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

ہم تو یہی کہیں گے کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے آسیب پہنچایا ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اس سے بیزار ہوں جسے تم شریک کرتے ہو۔ (1473)

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

اس کے سوائے۔ تو تم سب میرے لیے تدبیر کرلو پھر مجھے مہلت نہ دو۔

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب اور تمہارا رب ہے۔ کوئی جاندار نہیں مگر وہ اس کی چوٹی کو پکڑے ہوئے ہے۔ میرا رب سیدھے رستہ پر ہے۔ (1474)

1473 - اِعْتَرٰی۔ عَرِیٌّ کے معنی ننگا ہوا۔ اور عُریان ننگے کو کہتے ہیں ﴿اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى﴾ [طٰہٰ: 118:20] ''تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے۔'' اور عَرَاءٌ میدان ہے یعنی جس کو کسی پردہ وغیرہ نے نہ ڈھانکا ہوا ہو ﴿لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ﴾ [القلم: 49:68] ''کھلے میدان میں ڈال دیا جاتا۔'' اور عَرَاہُ اور اِعْتَرَہُ کے معنی ہیں [قَصَدَ عَرَاہُ] (غ) اس کی جانب کا قصد کیا یا اس سے کچھ لینے کا قصد کیا اور یہاں مراد مصیبت کا وارد کرنا ہے مطلب ان کا یہ تھا کہ ہمارے کسی معبود نے تم کو مجنون بنا دیا ہے۔

1474 - ﴿اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا﴾ نَاصِيَةٌ پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں اور عرب [اٰخِذُ نَاصِيَةٌ] کا استعمال انتہائی ذلت اور عاجزی کے موقعہ پر کرتے تھے۔ ان کا مطلب اس سے ہوتا تھا کہ دوسرا شخص اسے جس طرح چاہتا چلاتا ہے اور یہ بھی ان میں دستور تھا کہ ایک قیدی کو جب چھوڑنا ہوتا تو نشان کے طور پر اس کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے کامل تصرف میں ہیں اور رب کے صراط مستقیم پر ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ سب سے عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔ اچھے سے اچھا، برے سے برا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَ يَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

سو اگر تم پھر جاؤ تو میں نے تمہیں پہنچا دیا ہے جو مجھے دے کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اور میرا رب تمہارا جانشین دوسرے لوگوں کو بنا دے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ میرا رب تمام چیزوں پر نگہبان ہے۔ (1475)

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

اور جب ہمارا حکم آ گیا ہم نے ہود کو اور انہیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے بچایا۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۫ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

اور وہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش دشمن (حق) کے حکم کی پیروی کی۔ (1476)

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ ع 5 11 5

اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگی اور قیامت میں بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سنو! ہود کی قوم عاد پر پھٹکار ہے۔ (1477)

1475 - ﴿تَوَلَّوْا﴾ اصل میں تَتَوَلَّوْا ہے۔ یہاں بعض نے خطاب کا انتقال کفار قریش کی طرف سمجھا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہود کے ذکر میں سمجھانا تو انہی لوگوں کو اصل مقصود تھا۔

1476 - ﴿عَنِيْدٍ﴾۔ عَنَدَ کے معنی حد اور اندازہ سے نکل گیا اور [عَنَدَ عَنِ الْحَقِّ] حق سے پھر گیا اور مُعَانِدَةٌ اور عناد یہ ہے کہ ایک چیز کو پہچانے اور پھر اس کا انکار کر دے۔ پس عَنِيْدٌ وہ حق سے پھرنے والا باغی ہے جو باوجود علم کے حق کو رد کرتا ہے۔ (ل)
تِلْكَ میں اشارہ یا تو ذہنی ہے اور اشارہ بعید تحقیر کے لیے یا ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہے یا ان کی ویران شدہ سرزمین کی طرف اشارہ ہے۔

1477 - ﴿بُعْدًا﴾۔ بُعْدَ قرب کی ضد ہے اور محسوس اور معقول میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور بَعِدَ کے معنی ہیں مر گیا۔ اس لیے اس کا

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں تمہیں آباد کیا سو اس کی بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ میرا رب نزدیک (اور) قبول کرنے والا ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

انہوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے تجھ پر ہمیں امید تھی کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ اس کی عبادت کریں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے اور یقیناً ہمیں اس کے متعلق شک ہے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔ (1478)

استعمال ہلاکت میں ہوتا ہے۔ ﴿بَعِدَتْ ثَمُوْدُ﴾ [هود: 95:11] ''ثمود پر پھٹکار ہوئی۔'' اور بُعْدًا اور بَعَدًا ہلاکت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دوری کے لیے بھی ﴿فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [المؤمنون: 41:23] ''پس ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے۔'' (غ) اور یہاں چونکہ قوم ہلاک ہو چکی ہے اس لیے مراد رحمت الٰہی سے دوری ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عاد ہلاک ہوئے ایسی اور قومیں بھی ہلاک ہوں گی جو وہی راہ اختیار کریں۔

1478 - ﴿مَرْجُوًّا﴾۔ رَجَاءٌ ایسا ظن ہے جس کا اقتضا خوش کرنے والی بات کا حصول ہو۔ یعنی کسی بہتری کی امید۔ (غ) پس مَرْجُوٌّ وہ شخص ہے جس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوں۔

﴿مُرِيْبٍ﴾۔ رَابَ اور اَرَابَ کے معنی ہیں رَيْبَ میں ڈالا اور رَيْبَ یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی امر کا وہم کیا جائے۔ پھر وہ چیز اس وہم سے صاف ہو جائے۔ (غ)

مخلوق خدا کی خدمت فطرت انبیاء ہے:

حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق ان کی قوم کا یہ اعتراف کہ آپ سے اس سے پہلے ہماری بہت امیدیں وابستہ تھیں، بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام شروع سے ہی قوموں کی امید گاہ ہوتے ہیں۔ ان کا دل اور دماغ اور ان کی قوت عملی ایسی زبردست ہوتی ہے کہ قوم میں وہ اس دعوی سے پہلے ایک نمایاں امتیاز حاصل کر لیتے ہیں۔ تاریخی رنگ میں اس کا بہترین نظارہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ ہر قسم کے باطل سے متنفر، کھیل کود سے الگ ہر وقت خدمت قومی میں لگے ہوئے ہیں۔ بعثت سے پہلے [ثِمَالَ

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے کھلی دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تو کون اللہ کے خلاف میری مدد کرے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔ تو تم سوائے گھاٹے کے میرا کچھ نہیں بڑھاتے۔

وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾

اور اے میری قوم یہ تمہارے لیے اللہ کی اونٹنی ہے (یہ) ایک نشان (ہے) سو اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرے اور اسے کوئی دکھ نہ پہنچاؤ، ورنہ تمہیں نزدیک کا عذاب آ پکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

مگر انہوں نے اسے مار ڈالا تو اس نے کہا اپنے گھر میں تین دن فائدہ اٹھالو، یہ وعدہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾

سو جب ہماری سزا آ گئی تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے (اس سے) بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے، تیرا رب طاقتور غالب ہے۔

الْيَتَامَى عِصْمَةً لِلأَرَامِلِ] (صحيح البخارى، كتاب الاستسقاء، باب سُؤَالِ النَّاسِ الإِمَامَ الاِسْتِسْقَاءَ إِذَا قَحَطُوا، حديث:1008) ہیں غریبوں اور بیکسوں کے ملجا اور ماویٰ ہیں۔ دن رات مخلوق خدا کی فکر ہے نیکی اور راستبازی ایسی مسلم ہے کہ کوئی شخص آخر تک حرف نہیں رکھ سکا۔ درحقیقت قرآن کریم نے جو مختلف نقشے انبیاء کے کھینچے ہیں وہ آنحضرت ﷺ کے متعلق ہی توجہ دلانے کے لیے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ ان ساری باتوں کے باوجود قوم کے اندر سے بدی کی جڑ کاٹنا چاہتے ہیں تو شیاطین کا گروہ ان کا دشمن ہو جاتا ہے۔

وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۶۷﴾

اور جو ظالم تھے انہیں ہولناک آواز نے آپکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ (1479)

كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ ع 6 8 6

گویا کہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔ سنو ثمود نے اپنے رب کا انکار کیا، سنو ثمود پر پھٹکار ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾

اور یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔ کہا سلامتی ہو، اس نے کہا سلامتی اور دیر نہ کی کہ بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔ (1480)

1479 - صَیْحَةُ آواز بلند کرنے کا نام ہے۔ (غ) جس کو یہاں صَیْحَةُ کہا ہے اسی کو [الاعراف: 80:7] میں رَجْفَةٌ یا زلزلہ کہا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی عذاب کی مختلف حالتوں کے یہ نام ہیں۔ زلزلہ سے پہلے بھی خطرناک آواز آتی ہے۔ یہاں قریباً قریباً انہی الفاظ میں اونٹنی اور اس کے مارا جانے اور عذاب آنے کا ذکر ہے۔ جیسے سورہ اعراف میں۔ [دیکھو الاعراف: 7، رکوع: 10]

1480 - ﴿حَنِیْذٍ﴾۔ دو (گرم) پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا ہوا اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے رطوبت نکل جائے۔ (غ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یہاں اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ہے۔ لیکن **جو رسول لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب کی خبر لائے تھے وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی بشارت لائے تھے۔** اس لیے قرآن کریم نے یہاں اور کئی اور موقعوں پر جہاں قوم لوط کے عذاب کا ذکر کیا ہے اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں فرزند کی بشارت سے شروع کیا ہے۔ اس اکٹھے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی تباہی نہیں چاہتا بلکہ ان پر بڑے بڑے انعام کرتا رہتا ہے۔ ہاں جب ایک قوم بدی میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو نسل انسانی کو بچانے کے لیے اس کی تباہی ضروری ہو جاتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم لوط کے عذاب سے پہلے اپنی ایک عظیم الشان رحمت کی خبر دی اور بتایا کہ اگر ایک قوم تباہ ہوتی ہے تو تمہاری ہی نسل سے ایک دوسری قوم کھڑی کی جاتی ہے۔

یہ رسول فرشتے تھے یا انسان؟ یہ رسول کون تھے؟ ان آنے کی غرض بتائی ﴿اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ﴾ [70] کون تھے۔ روایات میں ہے کہ وہ فرشتے تھے اور ان کی تعداد بارہ سے لے کر تین تک بیان کی جاتی ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ وہ جبریل، میکائیل اور عزرائیل تھے۔ بائبل میں [پیدائش: 18] باب میں بھی یہی ذکر ہے اور وہاں بھی ان کو آدمیوں کی شکل

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ

مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں اٹھتے اس نے انہیں اجنبی سمجھا اور ان سے دل میں ڈرا۔

میں فرشتے ہی قرار دیا ہے اور ان کی تعداد بھی تین ہی لکھی ہے۔ مگر تمام واقعات جن کا ذکر ہے انہیں انسان ٹھہراتے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا ان کی مہمانی کرنا اور ان کا کھانا کھانا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان کے ساتھ چلنا وغیرہ۔ اور وہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کا بیٹے کی بشارت دینا اور پھر سدوم یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی بستی کی طرف جانا مذکور ہے۔ قرآن کریم میں صراحت سے یہ ذکر کہیں نہیں کہ یہ فرشتے تھے۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام ان کے سامنے کھانا لائے تو انہوں نے کھایا نہیں۔ مگر ان کے دوسرے سارے حالات انسانوں سے ملتے ہیں اور کھانا نہ کھانے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے اس وقت انہیں بھوک ہی نہ ہو یا روزہ سے ہوں اور آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ فرشتے تھے۔ رہا یہ کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اس زمانہ میں کوئی ایسے صالح لوگ ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوش خبری دی ہو اور انہوں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے پہلے خود بھی اولاد کی خوشخبری دی تھی مگر چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش سے وہ پیشگوئی پوری بھی ہو چکی تھی اس لیے ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خیال یہ ہو کہ اب اور اولاد ان کے ہاں نہ ہوگی۔ تب اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے ذریعہ سے ان کو یہ خبر پہنچائی کہ سارہ کے بطن سے بھی ان کے ہاں اولاد ہوگی۔ اور اصل میں یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم علیہ السلام کی طرف بھیجے گئے تھے جو ایک بدکار قوم تھی اور خلاف وضع فطرت انسانی افعال شنیعہ کا ارتکاب کرتی تھی اور ان کو وہاں بھیجنے کا منشا اس قوم پر اتمام حجت کے رنگ میں معلوم ہوتا ہے یعنی آپس میں تو ایسے افعال کرتے تھے مگر جب مہمانوں پر دست درازی کریں جو نہ صرف ان افعال بد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ جن کی تکریم لازم تھی تو اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر بھڑک اٹھے۔ اگر یہ فرشتے ہوتے جن کی وساطت سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام انسانوں کو پہنچاتا ہے تو پھر اس کی صورت وہی ہونی چاہیے تھی جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے ﴿اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ﴾ [الشوریٰ: 51:42] ''یا رسول بھیجے پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔'' یعنی ملک رسول کو بھیجتا ہے تو وحی کرتا ہے اور کلام وحی اور اس ملک کا آنا اس رنگ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے عالم میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ پر جب جبریل وحی لے کر آتا تو کوئی دوسرا شخص اسے نہ دیکھ سکتا تھا، نہ اس کے کلام کو سن سکتا تھا۔ حالانکہ سب سے زیادہ پرزور اور پرشوکت وحی رسول اللہ ﷺ کو ہی ہوئی۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کو وحی اس رنگ میں ہی ہوسکتی تھی جس طرح ہمارے نبی کریم ﷺ کو ہوئی اور ان واقعات میں چونکہ وہ رنگ نہیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ یہ کوئی صالح انسان تھے، جن کو بطور ایک نشان کے قوم لوط کی طرف بھیجا گیا اور اسی لحاظ سے ان کو رسول کہا گیا۔ جیسا کہ ایک جگہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے متعلق بھی فرمایا کہ ہم نے اس اونٹنی کو بھیجا ﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ﴾ [القمر: 27:54] ''ہم اونٹنی کو ان کی آزمائش کے طور پر بھیجنے والے ہیں۔''

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝

انہوں نے کہا نہ ڈر ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ (1481)

وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝

اور اس کی عورت کھڑی تھی سو وہ خوش ہوئی تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے (ایک پوتے) یعقوب کی خوشخبری دی۔ (1482)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فوراً بھنا ہوا بچھڑا لے آنا بتاتا ہے کہ کس قسم کی مہمان نوازی اخلاق انسانی کو کمال تک پہنچانے کے لیے بکار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے سوال نہیں کرتے کہ تم کھانا کھاؤ گے یا نہیں۔ بلکہ فوراً بہتر سے بہتر غذا جو ان کی مقدرت میں ہے لا حاضر کرتے ہیں۔ گویا اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ مہمان سے دریافت کرنا بھی مہمان نوازی میں ایک قسم کا نقص ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس قدر تکلیف کرتے ہیں حالانکہ وہ مہمان کھانا کھاتے بھی نہیں اور اس واقعہ کا ذکر اس غرض کے لیے کیا ہے کہ ہر نبی کی زندگی میں جس خاص خلق کا ذکر کیا ہے وہ بدرجہ اتم ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھا اور خاص خاص اخلاق کی طرف توجہ دلانے کی غرض یہی ہے۔

سلام کا لفظ اختیار کر کے بتایا ہے کہ **صلحا کا سلام** ایک دوسرے کو ہمیشہ یہی رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قوم جس کو آج سوائے گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ کے اور کچھ آتا ہی نہیں ان کی کتاب مقدس میں خود حضرت مسیح کا سلام جو انہوں نے حواریوں کو کیا یہی لکھا ہے ''یسوع انہیں ملا اور کہا سلام۔'' [متی: 9:28]

1481 - نَكِرَ۔ اَنْكَرْتُ اور نَكَّرْتُ ایک معنی میں ہیں اور انکار عرفان یعنی پہچاننے کی ضد ہے اور نَكِرَهُمْ اسی معنی میں ہے۔ (غ) اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ان کے ہاں مہمان آتا اور وہ کھانا نہ کھاتا تو سمجھتے تھے کہ یہ کسی بد ارادہ سے آیا ہے۔ (ج)

﴿اَوْجَسَ﴾۔ وَجْس صوت خفی یعنی ایسی آواز کو کہتے ہیں جو سنی نہ جائے اور اِیْجَاسٌ ایسی آواز کا اندر پانا ہے۔ (غ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے نہ کھانے کو دستور ملک کے مطابق اس بات پر محمول کیا کہ ان کا ارادہ اچھا نہیں۔ اس لیے آپ نے دل میں ان سے خوف محسوس کیا۔ جس کا جواب انہوں نے دیا کہ تمہارے لیے تو خوشخبری ہے۔ ہاں اگر ہم برائی کی خبر لائے ہیں تو وہ قوم لوط کے لیے ہے۔

1482 - ضَحِكَتْ۔ ضِحْكٌ۔ چہرہ کا انبساط ہے اور دانتوں کا ظاہر ہونا ہے جو دل میں خوشی پیدا ہونے سے ہو اور استعارۃً استہزا یا تمسخر پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ﴾ [المؤمنون: 110:23] ''اور تم ان پر ہنسی اڑاتے تھے۔'' اور ﴿اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ﴾ [الزخرف: 47:43] ''تو وہ ان پر ہنسی کرنے لگے۔'' اور صرف خوش ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے ﴿مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ﴾ [عبس: 38:80-39] ''چمک رہے ہوں گے۔ خوش۔'' ﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا﴾ [التوبة: 82:9] ''سو

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

اس نے کہا مجھ پر تعجب! میں جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ (1483)

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

انہوں نے کہا، کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اے اہل بیت اللہ کی رحمت اور برکتیں تم پر ہیں۔ وہ تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ﴿۷۴﴾

سو جب ابراہیم سے ڈر جاتا رہا اور اسے خوش خبری پہنچی لوط کی قوم کی نسبت ہم سے جھگڑنے لگا۔ (1484)

تھوڑا ہنسیں۔'' اور مجرد تعجب پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ (غ)

﴿وَّرَآءِ﴾۔ اس کا مادہ وَرْیٌ ہے اور اس کے معنی دونوں طرح آتے ہیں۔ پیچھے اور آگے۔ گویا وہ وہ چیز ہے جو تم سے چھپی ہوئی ہو آگے ہو یا پیچھے۔ (ت) پس ﴿مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ﴾ کے معنی ہوئے اسحاق سے آگے یعنی اگلی نسل میں یا اسحاق کی اولاد۔ گویا صرف بیٹے کی خوشخبری نہیں بلکہ ایک قوم کے پیدا ہونے کی خوش خبری ہے۔ اس لیے بتایا کہ اس بیٹے کے بھی بیٹا ہوگا۔ اور تاج العروس میں ہی ہے: [اَلْوَرَاءُ اَيْضًا وَلَدِ الْوَلَدِ] یعنی بیٹے کے بیٹے کو بھی وَرَاءٌ کہا جاتا ہے۔ یہی معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ (ج)

﴿امْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ﴾ میں بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی بھی مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھیں اور ان کے ضَحِكَ سے مراد اگر ہنسنا یا خوش ہونا لیا جائے تو اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کو اطمینان ہو گیا کہ یہ لوگ ہمارے متعلق کوئی بری خبر نہیں لائے، بلکہ قوم لوط کے لیے لائے ہیں اور اسحاق علیہ السلام کی خبر پر یہ خوشی نہیں کیونکہ وہ خبر ابھی بعد میں ملتی ہے اور یا ضَحِكَ بمعنی تعجب ہے اور تعجب انہیں اس بات پر ہوا کہ حالانکہ دونوں میاں بی بی ان کی خدمت میں مشغول رہے مگر انہوں نے کھانا نہ کھایا۔

1483 - ﴿يٰوَيْلَتٰٓى﴾۔ وَيْلٌ کے اصل معنی برائی ہیں۔ مگر یہ کلمہ يٰوَيْلَتَا اہل عرب تعجب کے وقت بھی بولتے ہیں۔ (ج)

1484 - رَوْعٌ۔ رُوْعَ دل کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے: [اِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوْعِي] (کنزالعمال فی سنن الاقوال، جلد4، صفحہ19، حدیث:9290) روح القدس نے میرے دل میں ڈالا۔ اور رَوْعٌ وہ چیز ہے جو دل کو پہنچے اور خوف کو جو دل

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾

یقیناً ابراہیم بردبار، نرم دل (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔(1485)

يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

اے ابراہیم یہ خیال چھوڑ دے کیونکہ تیرے رب کا حکم آ چکا ہے اور ان پر وہ عذاب آنے والا ہے جو ردّ نہیں ہوسکتا۔

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے وہ ان کی وجہ سے مغموم ہوا اور ان کے معاملہ میں ہاتھ کو تنگ پایا اور کہا یہ دن بڑا سخت ہے۔(1486)

میں ڈالا جائے رَوع کہا جاتا ہے۔ (غ) اور حدیث میں ہے: [اَللّٰهُمَّ اٰمِنْ رَوْعَاتِيْ] (المستدرك على الصحيحين للحاكم، جلد1، صفحہ698، ؛1902) اور [رَوْعَاتَ، رَوْعَةٌ] کی جمع ہے یعنی ایک مرتبہ خوف۔ (ل)

﴿يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾ یعنی لوط کی قوم پر جو عذاب کی خبر انہیں ملی تو اس کے ٹل جانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اسے مجادلہ اس لیے کہا کہ ارادۂ الٰہی ظاہر ہو چکا تھا۔

1485 - ﴿مُّنِيْبٌ﴾۔ نَوْب کے معنی ایک چیز کا بار بار لوٹ کر آنا اور نَائِبَةٌ حادثہ کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ لوٹ لوٹ کر آتا ہے اور اِنَابَةٌ یہ ہے کہ توبہ اور اخلاص عمل سے بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے ﴿خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ﴾ [صٓ: 24:38] ''رکوع کرتا ہوا گر گیا اور (اللہ کی طرف) متوجہ ہوا۔'' ﴿وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ [الزمر: 54:39] ''اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو۔'' ﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ﴾ [الروم: 31:30] ''اس کی طرف رجوع کرنے والے (رہو)۔''

1486 - ﴿سِيْٓءَ بِهِمْ﴾ سُوْءٍ وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈالے (غ) اس لیے ﴿سِيْٓءَ بِهِمْ﴾ کے معنی ہیں ان کی وجہ سے مغموم ہوا۔

﴿ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا﴾ ذِرَاعٌ ہاتھ ہے یعنی کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے آخر تک ہے ﴿ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا﴾ [الحاقة: 32:69] ''جس کی ناپ ستر ہاتھ ہے۔'' اور ذَرْع کے معنی طاقت بھی آتے ہیں جس طرح يَدٌ کے معنی طاقت ہیں اور [ضَاقَ بِالْاَمْرِ ذَرْعُهُ] کے معنی ہیں اس کی طاقت اس معاملہ میں کمزور ہوئی۔ (ل)

﴿عَصِيْبٌ﴾۔ عَصَبٌ پٹھے کو کہتے ہیں اور عَصَبٌ کا استعمال ہر سختی اور مضبوطی پر ہے اور عَصِيْبٌ کے معنی سخت ہیں۔ (غ)

جب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آتے ہیں تو ان کو اپنی قوم کی بدکاری کی وجہ سے یا اس لیے کہ ان کی قوم

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

اور اس کے پاس اس کی قوم دوڑتی آئی اور وہ پہلے سے برے کام کرتے تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے سب سے بڑھ کر پاک ہیں سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟(1487)

اس بات کو پسند نہ کرتی تھی کہ اجنبی لوگ ان کے پاس آ کر ٹھہریں جیسا کہ ﴿اَوَ لَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾[الحجر: 70:15] ''کیا ہم نے تمہیں جہان (کے لوگوں) سے روکا نہیں۔'' سے ظاہر ہے۔ ان کی حفاظت کی فکر ہوئی اور ان کو خوف ہوا کہ وہ ان مہمانوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ اس لیے وہ مغموم ہوئے۔

1487 - ﴿يُهْرَعُوْنَ﴾۔ هَرَعَ اور اَهْرَعَ کے معنی ہیں اس کو سختی سے اور ڈرا کر خوب چلایا۔ (غ) اور ابن جریر نے يُهْرَعُوْنَ کے معنی میں یہ شعر نقل کیا ہے: [فَجَاؤُا يُهْرَعُونَ وَ هُمْ اُسَارٰى .... نَقُوْدُهُمْ عَلٰى رَغْمِ الْاَنُوْفِ] جس سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ قیدیوں کو سختی کے ساتھ اور ڈرا کر چلایا جاتا ہے اور وہیں ہے کہ جب انسان سردی یا غضب یا بخار سے کانپتا ہو تو اس پر بھی اَهْرَعَ کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں ان کے تیز چلنے کو طلب فاحشہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ (ج)

ضَيْفٌ۔ ضَيْفٌ کے اصل معنی مَيْلٌ یعنی مائل ہونا ہیں۔ پس ضَيْفٌ وہ ہے جو تمہارے پاس ٹھہرتا ہوا تمہاری طرف مائل ہو یعنی مہمان اور چونکہ اس کا اصل مصدر ہے اس لیے واحد جمع میں یکساں استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے ضِيَافَةٌ ہے اور اِضَافَةٌ کا استعمال جو نحو میں ہوتا ہے وہ بھی اسی سے ہے۔ (غ)

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے متعلق يُهْرَعُوْنَ کا لفظ بتاتا ہے کہ وہ کسی خوف کے مارے دوڑے آئے اور ممکن ہے کہ وہ اسی خوف سے آئے ہوں کہ حضرت لوط علیہ السلام اجنبیوں کو اپنے پاس جمع کر رہے ہیں گو اگلے الفاظ اس معنی کی تائید نہیں کرتے۔ جہاں ان کی پہلی بدکاریوں کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی وہ اسی ارادہ سے آئے تھے اور اس قوم کی بے حیائی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ علی الاعلان اور مہمانوں کے ساتھ بھی بے حیائی کے ارتکاب کی خواہش سے اندھے ہو گئے اور کسی قسم کا لحاظ ان کو باقی نہ رہا۔

حضرت لوطؑ کی بیٹیاں:

﴿هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ﴾ اس کے ایک معنی تو یہ کیے گئے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کو بچانے کے لیے فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں تم ان سے نکاح کر لو۔ کیونکہ وہ لوگ پہلے حضرت لوط علیہ السلام سے ان کی بیٹیاں نکاح میں مانگتے تھے تو آپ

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

انہوں نے کہا تو جانتا ہے ہمارا تیری بیٹیوں پر کوئی حق نہیں اور تو خوب جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ (1488)

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

اس نے کہا کاش مجھ میں تمہارے (مقابلہ) کے لیے طاقت ہوتی بلکہ میں ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں۔ (1489)

انکار کرتے تھے۔ اپنے مہمانوں کی حفاظت کے لیے آپ نے اس بات کو بھی قبول کیا کہ وہ اپنی لڑکیاں ان کو نکاح میں دے دیں اور بعض کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے صرف ان کو شرم دلانا مقصود تھا۔ حقیقت میں نکاح میں دینا مقصود نہ تھا اور مجاہد اور قتادہ، ابن جریج وغیرھم سے روایت ہے کہ ﴿هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِيْ﴾ میں اشارہ عورتوں کی طرف تھا کہ قضائے شہوت کے لیے تمہاری بیویاں موجود ہیں اور وہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں۔ پس تمام حرام اور فاحش طریقوں کو چھوڑ دو اور عام عورتوں کو بَنَاتِيْ اس لحاظ سے کہا کہ نبی اپنی امت کے لیے باپ کے حکم میں ہوتا ہے۔ (ج) یہ آخری تاویل کسی قدر کمزور ہے اس لیے کہ نبی کا باپ ہونا مومنوں کے حق میں ہوتا ہے نہ کفار کے۔ مگر پھر بھی مجازاً بَنَاتِيْ سے مراد عام عورتیں لی جاسکتی ہیں اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں کہ آپ نے مرد اور عورت کے قدرتی اور پاکیزہ تعلق کی طرف توجہ دلائی۔ **بائبل میں ایک نہایت فحش قصہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹیوں کے متعلق** لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کو شراب پلا کر اس سے زنا کیا۔ انبیاء کے متعلق ایسے ناپاک قصے بیان کر کے بھی یہ کتاب مقدس کہلاتی ہے اور عیسائی اسے فخر سے دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔ کچھ تھوڑی سی حیا ہوتی تو اس قسم کے فحش قصوں کو ہی اس کتاب سے نکال دیتے۔

1488 - اس جواب میں کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تم دوسری قوم سے ہو۔ اس لیے ہم تمہاری بیٹیوں سے نکاح نہیں کر سکتے یا یہ کہ تم ان کے متعلق پہلے انکار کر چکے ہو۔

1489 - رُكْنٍ ایک چیز کا رکن اس کی وہ جانب ہے جس سے وہ سکون پکڑتی ہے اس لیے استعارۃً اس کے معنی قوت ہیں یہی سہارا اور اسی سے رَكَنَ کے معنی ہیں ایک جانب مائل ہوا ﴿لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ [هود: 113:11] ''ان کی طرف نہ جھکو جو ظالم ہیں۔'' اور عبادت کے ارکان وہ باتیں ہیں جن پر اس کی بنا ہے اور جن کے ترک کرنے سے وہ باطل ہو جاتی ہیں۔ (غ)

رُكْنٍ شَدِيْدٍ سے مراد:

پہلے اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔ کاش مجھ میں یہ طاقت ہوتی کہ میں تمہارا مقابلہ کر کے اپنے مہمانوں کو تم سے بچا سکتا۔ لیکن چونکہ مجھ میں یہ طاقت نہیں اس لیے پھر فرمایا ﴿اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴾ بلکہ میں ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں۔ اور گو اس مضبوط سہارے سے بعض مفسرین نے مراد کنبہ لیا ہے مگر حدیث نبوی سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے۔ چنانچہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں: [يَرْحَمُ اللّٰهُ لُوطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِي إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ] (صحيح البخاري، كتاب

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

انہوں نے کہا اے لوط ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں وہ تجھ تک نہ پہنچ سکیں گے تو کچھ رات سے اپنے اہل کو لے کر نکل سوائے تیری عورت کے اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ اس پر وہی مصیبت آنے والی ہے جو ان پر آ رہی ہے۔ ان کا مقرر وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟(1490)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾

سو جب ہمارا حکم آ گیا ہم نے اسے تہہ و بالا کر دیا اور ہم نے اس پر سخت پتھر پے در پے برسائے۔(1491)

التفسیر، باب5، حدیث:4694) (ج) اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام پر رحم کیا کیونکہ وہ ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی۔

1490 - اَسْرِ۔ سَرَی اور اَسرَی کے معنی ہیں رات کے وقت چلا ﴿بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ﴾ رات کا کچھ حصہ۔

﴿يَلْتَفِتْ﴾۔ اِلْتِفَاتٌ کے لیے [دیکھو نمبر:1421]۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہاں [لَا يَتَخَلَّفْ] معنی مروی ہیں یعنی پیچھے نہ رہے۔ (ر) اور بعض نے پھر کر دیکھنا مراد لیا ہے۔

وہ لوگ اس وقت کس طرح اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے اس کی تفصیل قرآن کریم نے نہیں دی۔ بعض آثار میں ہے کہ وہ اندھے کر دیئے گئے۔

1491 - عَالِی۔ سَافِلُ۔ سُفْلِ۔ عُلُوّ کی ضد ہے اور اَسْفَلُ اَعْلٰی کی۔ (غ) ﴿وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ [الأنفال: 42:8] ''اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔'' میں مراد ایسی طرف ہے جو بوجہ ساحل سمندر کے قریب ہونے کے مدینہ سے نیچی تھی یعنی سطح سمندر سے اس کی بلندی کم تھی ﴿مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ [الأحزاب: 10:33] ''تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے۔'' میں بھی پست زمین مراد ہے: ﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾ [التوبة: 40:9] ''اور ان لوگوں کی بات کو جو کافر تھے نیچا دکھایا۔'' میں مغلوبیت مراد ہے ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ﴾ [التين: 5:95] ''پھر ہم اسے ذلیل حالت کی طرف بھی لوٹا دیتے ہیں۔'' میں ذلیل حالت مراد ہے۔

سِجِّيْلٍ کو سنگ گل (یعنی مٹی کا پتھر) سے معرب خیال کیا گیا ہے لیکن اس لفظ کا مادہ سِجِلّ زبان عربی میں موجود ہے اور اس کے

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع 7 15 7

تیرے رب کے ہاں سے نشان لگائے ہوئے اور وہ ظالموں سے دور نہیں۔ (1492)

مشتقات بکثرت زبان عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے سِجِّیْلٍ کو معرب خیال کرنا صریح غلطی ہے۔ سجل بڑے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی سے بھرا ہوا ہو اور ابوسفیان کا قول ہے [اَلْحَرْبُ بَيْنَنَا سِجَالٌ] یعنی کبھی ایک طرف کو غلبہ ہوتا ہے کبھی دوسری طرف کو۔ اور ایک حدیث میں سورت کی قراءت کے متعلق ہے فَسَجَلَهَا یعنی اس کو ملی ہوئی قراءت کے ساتھ پڑھا۔ کیونکہ سَجَلَ کے معنی صَبَّ یعنی گرانا بھی آتے ہیں اور اَسْجَلَ کے معنی اَرْسَلَ یا اَطْلَقَ آتے ہیں یعنی بھیجا اور چھوڑ دیا یا آزاد کیا۔ اور سجل کتاب عہد کو کہتے ہیں اور ابوعبیدہ کہتے ہیں ﴿مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ کے معنی ہیں: [كَثِيْرَةٌ شَدِيْدَةٌ] یعنی بہت اور سخت اور بعض کے نزدیک سِجِّیْل اَسْجَلَ بمعنی اَرْسَلَ سے ہے یعنی چھوڑ دیا۔ گویا وہ پتھر ان پر بھیجے گئے یا چھوڑے گئے اور یا سِجِّیْلٍ سے مراد سِجِّل ہے یعنی لکھے ہوئے گویا وہ ان کے لیے مقدر ہو چکے تھے ور سِجِّیْلٍ اور سِجِّیْنَ کے ایک ہی معنی ہیں اور سِجِّیْنَ بمعنی کتاب مرقوم قرآن شریف میں ہے: ﴿وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝﴾ [المطففين: 83:8-9] ''اور تو کیا جانتا ہے قید خانہ کیا ہے؟ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔'' (ل) اور ابن جریر نے بعض اہل علم کا قول نقل کیا ہے کہ سِجِّیْلٍ سے مراد سخت ہے۔

﴿مَّنْضُوْدٍ﴾۔ نَضْدٍ سامان کے ایک دوسرے کے اوپر رکھنے پر بولا جاتا ہے۔ (غ) اور مَنْضُوْدٍ کے معنی ہیں: [يَتْبَعُ بَعْضُهُ بَعْضًا] (ج) ایک دوسرے کے پیچھے آتے تھے بالفاظ دیگر پے در پے برس رہے تھے۔ اور قرآن کریم میں ہے ﴿طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ [الواقعة: 29:56] ''وسیع سایہ۔'' اور ایسا ہی ﴿طَلْعٌ نَّضِيْدٌ﴾ [قٓ: 10:50] یعنی تہ بتہ۔

لوط علیہ السلام کی بستیاں کس طرح تباہ ہوئیں:

﴿جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا﴾ کی تفسیر میں مفسرین نے بعض آثار کی بنیاد پر لکھا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے زمین کے اس ٹکڑے کو اٹھا کر اتنا اونچا کیا کہ آسمان والوں نے مرغوں کی آواز اور کتوں کا بھونکنا سنا اور پھر اسے وہاں سے پھینکا۔ مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور اگر اس سے یہ مراد ہوتی تو پھر ساتھ پتھر برسانے کا ذکر بے معنی ہے۔ کیونکہ جب زمین کے نیچے کا حصہ اوپر آ گیا اور اوپر والا نیچے چلا گیا تو پتھر کہاں برسے؟ گویا قرآن کریم نے پتھر برسانے کا ذکر کر کے خود بتا دیا کہ عالی کو سافل بنانے سے مراد تہہ و بالا کرنا ہے اور دوسری جگہ اس قوم کے عذاب کو کہیں صرف ﴿اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا﴾ [النمل: 58:27] ''ہم نے ان پر ایک مینہ برسایا۔'' کہا ہے اور کہیں ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا﴾ [القمر: 34:54] ''ہم نے ان پر پتھر برسائے۔'' گویا صرف پتھروں کی بارش کا ذکر کیا ہے۔ پس یہی اصل عذاب تھا اور اسی کے ذریعہ سے وہ زمین تہہ و بالا کر دی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ پتھروں کی بارش آتش فشاں پہاڑوں سے ہوتی ہے اور پے در پے بھیجنے سے مراد بھی یہی منشا ہے۔

1492 - پتھروں کو مُسَوَّمَةً یا نشان لگائے ہوئے اس لیے کہا کہ گویا وہ ان کے لیے مقدر ہو چکے تھے اور ﴿مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور میں تم پر گھیر لینے والے دن کے عذاب کے آنے سے ڈرتا ہوں۔ (1493)

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

اور اے میری قوم ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور فساد پھیلاتے ہوئے زمین میں حد سے نہ بڑھو۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

جو اللہ کے پاس باقی رہتا ہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن بنو اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔ (1494)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ

انہوں نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ

﴿بِبَعِيْدٍ﴾ میں یہ بتایا کہ وہ جگہ ان ظالموں سے جو اس وقت حق کی مخالفت کر رہے ہیں دور نہیں۔ یعنی اسے دیکھتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے کہ اس پر تم گزرتے ہو اور یا مراد یہ ہے کہ ایسا ہی عذاب ان ظالموں کے لیے تیار ہے۔

1493 - خَيْرٌ۔ وہ چیز ہے جس میں سب رغبت کریں۔ اور اس کی ضد شَرّ ہے اور ایک چیز کو دوسری کے مقابلہ میں بھی خیر کہا جاتا ہے جیسے مال کثیر کو خیر کہا جاتا ہے اور یہاں مراد دنیوی نعمتیں یا آسائش کی حالت ہے۔ باقی کے لیے [دیکھو نمبر: 1120]

1494 - ﴿بَقِيَّتُ اللّٰهِ﴾ بَقَاءٌ کسی چیز کا پہلی حالت پر ثابت رہنا ہے اور اپنے نفس میں باقی رہنے والی صرف ذات باری ہے۔ باقی سب کا بقا اسی کی ذات سے ہے ایسا ہی بقا اہل جنت کا ہے۔ اور ﴿اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ﴾ [الکھف: 46:18] ''باقی رہنے والے اچھے عمل'' وہ اعمال ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہتا ہے۔ اور ﴿بَقِيَّتُ اللّٰهِ﴾ سے مراد بھی یہی ہے اور اس کی اضافت اللہ کی طرف ہے۔ (غ) اور اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا اللہ تعالیٰ کا رزق بھی کیے ہیں۔ (ج)

نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہیں (نہ) کریں بے شک تو بڑا بردبار سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔ (1495)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے اچھی روزی دی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کر کے وہ کام کروں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں میں سوائے اصلاح کے کچھ نہیں چاہتا جہاں تک میری طاقت ہے اور مجھے توفیق ملنا اللہ کی مدد سے ہی ہے اسی پر میں بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (1496)

وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ

اور اے میری قوم میری دشمنی تم سے ایسا نہ کرائے کہ تم پر ایسی ہی مصیبت آ پڑے جیسی نوح کی قوم

1495 - بظاہر ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز پڑھتے ہو تو پڑھو، ہماری باتوں میں دخل کیوں دیتے ہو۔ ہم اپنے پرانے طریق پر عبادت کرتے ہیں جس طرح ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ رہے مال سو وہ ہماری چیز ہے جس طرح پر چاہیں کریں، کم دیں یا زیادہ دیں۔ اور یہ جو کہا کہ تم حلیم رشید ہو تو بعض نے اسے بطور تحکم مراد لیا ہے یعنی تم اپنے زعم میں حلیم و رشید ہو۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی حلیمی اور رشد کے قائل تھے۔

1496 - **رزق حسن سے مراد** یہاں نبوت و حکمت ہے۔ (ر) کیونکہ یہی وہ رزق ہے جو انبیاء کو خصوصیت سے ملتا ہے اور ان کی اس بات کا کہ ہماری باتوں میں دخل نہ دو یہ جواب دیا ہے کہ میں تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور یہ کہ میں خود اسے اچھا سمجھتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں خود بھی اس پر عامل ہوں۔

قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

یا ہود کی قوم یا صالح کی قوم پر پڑی اور لوط کی قوم بھی تم سے دور نہیں۔ (1496)

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

اور اپنے رب کی بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پھر آؤ، میرا رب رحم کرنے والا محبت کرنے والا ہے۔ (1497)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

انہوں نے کہا اے شعیب ہمیں بہت سی وہ باتیں سمجھ نہیں آتیں جو تو کہتا ہے اور ہم تجھے اپنے اندر کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تیرے بھائی بند نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے اور تو ہم پر غالب نہیں۔ (1498)

1496(ل)- یہاں کیسی صفائی سے بتا دیا کہ جس طرح ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی بھی قوم پر عذاب آیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ **طوفان نوح کا عذاب صرف قوم نوح کے لیے تھا** نہ کل عالم کے لیے۔ سارے قرآن شریف میں جہاں جہاں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے ان کی قوم کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح دوسرے انبیاء کی قوموں کا۔

1497- ﴿وَدُوْدٌ﴾۔ وُدٌّ کے لیے [دیکھو نمبر: 137(ل)]۔ اس میں محبت سے بڑھ کر ایک چیز کے ہونے کی تمنی بھی ہے اور وَدُوْدٌ وہ ہے جو بندوں سے مودّت رکھتا ہے یعنی بندوں کے لیے مراعاۃ یا ان کی حفاظت بھی اس میں شامل ہے۔ اور یا وَدُوْدٌ کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اللہ ایک ایسی قوم کو لاتا رہتا ہے جو اس سے محبت کرے اور جن سے وہ محبت کرے۔ (غ)

1498- رَهْطٌ کسی شخص کا رَهْطٌ اس کی قوم یا قبیلہ ہے اور تین یا سات سے دس تک کے عدد کو ظاہر کرتا ہے۔ (ل)

شعیب علیہ السلام کی نابینائی کی روایت:

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ایسی سادہ ہوتی ہے کہ عام انسان اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم سمجھتے نہیں گویا اس بات کے قائمقام ہے کہ ہم پروا نہیں کرتے۔ کیونکہ تم ہم میں کوئی طاقتور آدمی نہیں ہو کہ تمہاری بات کی ہم پروا کریں۔ ضعیف سے یہی مراد ہے اور یہ جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف کے معنی اندھا مروی ہیں تو یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ انبیاء ایسے عیوب سے پاک ہوتے ہیں اور یہاں لفظ ہیں کہ ہم تم کو اپنے اندر ضعیف پاتے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے مقابلہ میں تم کمزور ہو اور اگر ضعیف سے مراد اندھا لیا جائے جس پر لغت کی بھی شہادت نہیں تو معنی کچھ نہیں بنتے۔ کیونکہ اپنے اندر اندھا پانا بے معنی ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

اس نے کہا اے میری قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر اللہ سے زیادہ ہے اور تم نے اسے پیٹھ کے پیچھے ڈال رکھا ہے میرا رب اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو تم کرتے ہو۔ (1499)

وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

اور اے میری قوم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو میں بھی عمل کرنے والا ہوں تم جان لو گے کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور کون جھوٹا ہے اور دیکھتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ﴿۹۴﴾

اور جب ہمارا حکم آ گیا ہم نے شعیب کو اور انہیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت کے ساتھ بچا لیا اور جنہوں نے ظلم کیا ان کو سخت آواز نے آ پکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے ہی پڑے رہ گئے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ ع 8 12 8

گویا کہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔ سنو مدین پر پھٹکار ہے جیسے ثمود پر پھٹکار ہوئی۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۹۶﴾

اور ہم نے موسیٰ کو اپنے نشانوں اور کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

1499 - ظِهْرِیّ۔ ظَهْرٌ کے معنی پیٹھ اور ظِهْرِیّ اسے بھی کہتے ہیں جسے سواری کے لیے تیار کیا جائے اور اسے بھی جسے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا جائے۔ (غ) یہی دوسرے معنی یہاں ہیں۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا سو ان کو آگ پر پہنچا دے گا اور کیا ہی بری گھاٹ ہے جس پر پہنچے۔ (1500)

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی، برا انعام ہے جو دیا جائے گا۔ (1501)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾

یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں ان میں سے کچھ آباد اور (کچھ) اجڑی ہوئی ہیں۔

وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، سو جب تیرے رب کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جنہیں وہ اللہ کے سوائے پکارتے تھے اور ان کے حق میں ہلاکت ہی بڑھائی۔ (1502)

1500 - اَوْرَدَ۔ وَرُوْدٌ پانی کا قصد کرنا ہے۔ پھر اس کے غیر پر بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اور دوسرے مقامات پر آگ پر استعمال ہوا ہے گویا پانی کی جگہ آگ پائیں گے۔ (غ) اور وَرَدَ کا استعمال صرف پہنچنے پر ہے جب ابھی اس میں داخل نہ ہوا ہو جیسے: ﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ﴾ [القصص: 23:28] ''اور جب مدین کے پانی پر پہنچا'' اور جب ایک شخص کسی شہر تک پہنچ جائے مگر اس میں ابھی تک داخل نہ ہوا ہو تو کہا جاتا ہے [وَرَدَ بَلَدَ كَذَا] اور بعض کے نزدیک داخل ہو جائے یا نہ ہو دونوں حالتوں میں وَرَدَ کا استعمال ہوتا ہے۔ اور جوہری کا قول ہے کہ وَرُوْدٌ بالاجماع پہنچنے پر استعمال ہوتا ہے جب اس میں داخل نہ ہوا ہو۔ (ل) اور وِرْدٌ وہ لوگ ہیں جو پانی پر پہنچتے ہیں یا اونٹ وغیرہ اور پانی کی جگہ کو بھی وِرد کہا جاتا ہے اور وِرْدٌ قرآن کریم کے اس حصہ کو بھی کہا جاتا ہے جو مقرر طور پر پڑھا جائے۔ (ل) اور وَارِدٌ کے معنی ہیں آگے چلنے والا جو پانی لاتا ہے ﴿فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ﴾ [یوسف: 19:12] ''تو انہوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا'' (غ)

1501 - رِفْدٌ۔ رِفْدٌ عطیہ کو کہتے ہیں اور رفد عطیہ دیا۔ (غ)

1502 - ﴿تَتْبِيْبٍ﴾۔ تَبٌّ اور تَبَابٌ خسران یعنی گھاٹے میں پڑے رہنا ہے ﴿تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ﴾ [اللهب: 1:111] ''ابولہب

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے درآنحالیکہ وہ ظالم ہوں، ہاں اس کی پکڑ دردناک سخت ہوتی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾

یقیناً اس میں اس کے لیے نشان ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور یہ حاضری کا دن ہے۔ (1503)

وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾

اور ہم اسے ایک مقرر وقت کے لیے ہی پیچھے ڈال رہے ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

جس دن وہ آجائے گا کوئی شخص سوائے اس کے حکم کے بات نہیں کرے گا پھر ان میں سے بدقسمت اور خوش قسمت ہوں گے۔ (1504)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾

سو جو بدقسمت ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے لیے اس میں چیخنا اور چلانا ہوگا۔ (1505)

کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوئے۔'' ﴿وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ﴾ [المؤمن: 37:40] ''اور فرعون کی تدبیر ہی ہلاک ہونے والی تھی۔''

1503 - ﴿مَّشْهُوْدٌ﴾۔ شَهُوْدٌ کے معنی حاضر ہونا اور مَشْهُوْدٌ یہاں بمعنی شاہد ہے یعنی جس کا مشاہدہ ضرور ہوگا مطلب یہ کہ آ کر رہے گا۔ (غ)

1504 - ﴿شَقِيٌّ۔ سَعِيْدٌ﴾۔ شَقَاوَةٌ۔ سَعَادَةٌ کی ضد ہے اور سَعْدٌ اور سَعَادَةٌ انسان کے لیے بھلائی کے پانے پر امور الٰہیہ کی اعانت ہے اور شِقَاوَةٌ اور سَعَادَةٌ دنیوی بھی ہے اور اخروی بھی اور سب سے بڑی سعادت جنت ہے۔ (غ) یا سَعْدٌ۔ یُمْنٌ یعنی برکت ہے۔ یہاں شَقِيٌّ اور سَعِيْدٌ کی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ جو لوگ جنت میں داخل ہوں گے وہ سعید ہوئے اور جو آگ میں وہ شَقِی ہوں گے۔

1505 - ﴿زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ﴾ زَفِيْرٌ سانس کا اندر کو کھینچنا یہاں تک کہ پسلیاں اس سے پھول جائیں (غ) اور شَهِيْقٌ ۔۔۔ سانس کا

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾

اسی میں رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے کیونکہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

اور وہ جو خوش قسمت ہیں وہ جنت میں ہوں گے اسی میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے یہ بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔ (1506)

لوٹانا اور زَفِيْرٌ اس کا اندر کھینچنا ہے اور [جَبَلٌ شَاهِقٌ] بڑے بلند پہاڑ کو کہتے ہیں اور اسی سے شَهِيْقٌ ہے۔ (غ) دوزخ کے متعلق دونوں لفظ آتے ہیں ﴿سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا﴾ [الملك: 7:67] ''اس کا چیخنا سنیں گے۔'' ﴿سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا﴾ [الفرقان: 12:25] ''تو وہ اس کے جوش وخروش کو سنیں گے۔'' اور لسان العرب میں ہے کہ گدھے کی آواز کا پہلا حصہ زفیر ہے پچھلا شہیق۔ کیونکہ زفیر سانس کا اندر لے جانا ہے اور شہیق اس کا باہر نکالنا۔ اور اسی میں ہے کہ زفیر یہ ہے کہ انسان کا سینہ غم سے بھرا ہوا ہو پھر وہ اسے نکالے۔

1506- ﴿مَجْذُوْذٍ﴾۔ جَذٌّ کے معنی ہیں کسی چیز کا توڑنا اور اس کا فنا کر دینا ﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا﴾ [الأنبيآء: 58:21] ''سو ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔'' اور ﴿غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ کے معنی ہیں [غَيْرَ مَقْطُوْعٍ عَنْهُمْ] یعنی جوان سے کبھی قطع نہ کی جائے گی۔

یہاں جنت اور دوزخ کے ذکر میں کہ ان کے اندر ہمیشہ رہنا ہوگا ایک بین فرق نظر آتا ہے۔ یعنی دونوں میں ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ فرما کر دوزخ کی صورت میں پیچھے یہ لفظ لائے گئے ہیں کہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے یعنی چاہے تو انہیں دوزخ سے نکال دے اور بہشت کی صورت میں یہ کہ یہ عطا کبھی منقطع نہ ہوگی۔ یعنی بہشت سے کبھی کوئی شخص باہر نہ نکالا جائے گا۔ یہ کھلا فرق ہے جو صاف بتا رہا ہے کہ دوزخ کے لیے وہ ہمیشگی نہیں جو جنت کے لیے ہے۔ ہماری توجہ کو اس طرف پھیرتا ہے کہ آیا کبھی دوزخی دوزخ سے باہر بھی نکالے جائیں گے۔ ابن جریر نے **چار مختلف توجیہات** پہلی آیت کی تفسیر میں روایت کی ہیں۔ اول یہ کہ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ میں جو استثنا ہے وہ اہل توحید کے لیے ہے یعنی سب دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے سوائے اہل توحید کے کہ جو ایسے لوگ گنہگار رہوں گے ان کے لیے ہمیشگی نہیں ہوگی۔ دوم یہ کہ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ میں جو استثنا ہے وہ گنہگار اہل توحید کے دخول کے متعلق ہے یعنی سب گنہگار داخل نار ہوں گے مگر اہل توحید نہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ سب لوگوں کے متعلق ہے یعنی سب دوزخیوں کو آخر کار دوزخ سے نکال دیا جائے گا۔ چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل نار کے متعلق اپنی مشیت کی خبر نہیں دی، چاہے اللہ تعالیٰ ان کی سزا میں زیادتی کر دے اور چاہے کمی کر دے۔ ان چاروں توجیہات میں سے دوسری صریحاً غلط ہے۔ اس لیے کہ فساق اہل ایمان کا نار میں جانا صریح آیات قرآنی اور احادیث سے ثابت ہے۔ اور چوتھی میں جو یہ حصہ ہے کہ استثنا

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ

سو ان کے متعلق کچھ بھی شک نہ کر جن کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ اسی طرح عبادت کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے

سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چاہے تو دوزخ والوں کا عذاب بڑھادے یہ بھی بالبداہت باطل ہے۔ کیونکہ استثنا خلود سے ہے اور اس میں گھٹانے بڑھانے کا سوال نہیں خلود کا استثنا یہی ہوسکتا ہے کہ انہیں باہر نکال دے۔ اس لیے پہلی اور تیسری توجیہہ باقی رہ جاتی ہے۔ اول ہم پہلی توجیہہ کو لیتے ہیں۔

عصاۃ مومنین اور کفار کے خلود عذاب میں قرآن کریم نے کوئی فرق نہیں رکھا:

جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اہل ایمان میں سے نافرمان لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر معتزلہ اس کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک جو دوزخ میں پڑیں گے وہ ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے اور خوارج بھی اس کے قائل نہیں۔ جمہور کے مذہب کی بنا ان احادیث پر ہے جن میں شفاعت کا ذکر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا قرآن شریف نے نافرمانوں اور کافروں کی سزا میں کوئی ایسا امتیاز رکھا ہے؟ اس کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص جس نے قرآن شریف کو پڑھا ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ایسا کوئی فرق نہیں رکھا۔ بلکہ دونوں کے لیے یکساں خلود رکھا ہے۔ اور نہ صرف ہر ایک بدکار کے لیے دوزخ جگہ بتائی ہے بغیر اس امتیاز کے ظاہر کرنے کے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کر کے بدکاری کرتا ہے یا علی الاعلان کافر رہ کر۔ بلکہ صاف طور پر صرف حکم الٰہی کے نافرمانوں کا ذکر کر کے جن سے مراد صریحاً اسلام کا دعویٰ کرنے والے ہیں ان کے خلود فی النار کا ذکر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس آیت کو لو جو احکام وراثت کے بعد آتی ہے اور جس میں صریحاً مسلمانوں کا ذکر ہے جو ان احکام وراثت کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس میں یہ لفظ ہیں ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ [النسآء: 14:4] اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اس کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے اسے آگ میں داخل کرے گا اور اسی میں وہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اور جگہ پر بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی سزا ایسے ہی الفاظ میں بیان فرمائی ہے بلکہ اَبَدًا کا لفظ بھی ساتھ بڑھایا ہے ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝﴾ [الجن: 23:72] اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے ابد تک اسی میں رہے گا۔ ان نافرمانی کرنے والوں میں سے مسلمان کہلا کر نافرمانی کرنے والوں کو باہر رکھنا صریح الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔ پس جہاں تک خلود اور ابد کا سوال ہے وہ فساق اہل توحید اور کفار پر یکساں حاوی ہے۔ پس اگر ایک کے لیے کوئی استثنا ہے تو دوسرے کے لیے بھی استثنا ہے۔ اگر کوئی صحیح حدیث نبی کریم ﷺ کی ہوتی جس میں آپ نے فرمایا ہوتا کہ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ میں جو استثنا ہے وہ صرف اہل توحید کے لیے ہے تو بے شک وہ حجت تھی۔ مگر کسی تابعی یا تبع تابعی کا یہ خیال اسے حجت نہیں بنا سکتا۔ بلکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ صرف کفار کا ذکر کر کے جو اسلام کو قبول نہیں کرتے یوں فرمایا ﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ [الأنعام: 128:6] ''کہے گا آگ تمہارا ٹھکانا ہے اسی

اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ ع 9 14 9

باپ دادعبادت کرتے تھے اور ہم ان کو ان کا حصہ بغیر کم کیے پورا پورا دینے والے ہیں۔

میں رہو گے مگر جو اللہ چاہے۔'' یہاں یہی استثنا صرف کفار کے لیے موجود ہے یعنی خلود سے نکل بھی سکتے ہیں۔ ہاں احادیث شفاعت، سوان پر آگے بحث آتی ہے۔

جہنم پر فنا آنے کی شہادت:

پس اب صرف ایک توجیہہ باقی رہ جاتی ہے اور اس کی تائید میں نہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال موجود ہیں بلکہ احادیث شفاعت بھی اسی کی موید ہیں۔ اقوال صحابہ میں سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اہل نار کو آگ کھا جائے گی اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے [لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ تَخْفِقُ أَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ بَعْدَ مَا يَلْبَثُونَ فِيهَا أَحْقَابًا.] (تفسیر المنار، باب128، جلد8، صفحہ65) یعنی دوزخ پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اس میں کوئی نہیں ہوگا اور یہ اس کے بعد ہوگا جو اس میں احقاب تک رہ چکے ہوں گے۔ یہ دونوں قول ابن جریر میں منقول ہیں اور وہیں شعبی کا قول ہے [جَهَنَّمُ أَسْرَعُ الدَّارَيْنِ عُمْرَانًا وَأَسْرَعُهُمَا خَرَابًا.] یعنی دوزخ دونوں گھروں میں بننے میں بھی جلدی بنتا ہے اور ویران ہونے میں بھی سب سے جلدی ویران ہوگا۔ اور تفسیر فتح البیان میں اسی آیت کی تفسیر منادی الکبیر کی عبارت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کا عذاب جہنم ہمیشہ کے لیے ہوگا اور اس کے سوائے جس قدر اقوال ہیں ان کی تاویل واجب ہے۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ دوزخیوں کو ایک وقت تک عذاب ہوگا۔ پھر ان کی طبیعت ہی ان کے موافق ہو جائے گی اور اس وجہ سے وہ اس سے بھی لذت حاصل کریں گے اور کہ وعدہ کو سچا کرنا قابل تعریف امر ہے نہ وعید یعنی سزا کے وعدہ کو۔ بلکہ اس سے تجاوز کرنا نا قابل تعریف امر ہے اور آگے لکھا ہے کہ ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ دوزخ کو فنا کر دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک وقت رکھا ہے جس پر پہنچ کر وہ ختم ہو جائے گی۔ اور پھر لکھا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کے اقوال نقل کیے ہیں کہ دوزخ فنا ہو جائے گا۔ اور ابن قیم نے اس کی تائید کی ہے۔ مگر یہ مذہب متروک ہے اور جمہور نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ عصاۃ مومنین ہی دوزخ سے نکالے جائیں گے نہ کفار۔ اس کلام کو نقل کر کے فتح البیان میں ان اقوال کو لکھا ہے۔ مثلاً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول [لَوْ لَبِثَ أَهْلُ النَّارِ فِي النَّارِ كَقَدْرِ رَمْلِ عَالِجٍ لَكَانَ لَهُمْ يَوْمٌ عَلَى ذَلِكَ يُخْرَجُونَ فِيهِ.] یعنی اگر اہل دوزخ دوزخ میں اتنی مدت بھی رہے جیسے ریت کے انبار پر انبار تو بھی ایک دن ان پر آئے گا جس میں وہ نکالے جائیں گے اور اس روایت کے رجال کو ثقات قرار دیا ہے۔ اور ایک قول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے: [يَأْتِي عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَّا يَبْقَى فِيهَا أَحَدٌ] (تفسیر السمعانی، جلد2، صفحہ461) جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول جو اوپر نقل ہو چکا ہے اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سیدنا ابن العاص رضی اللہ عنہ کا قول [لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی

تَخْفِقُ أَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ.] جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کے دروازے بند ہو جائیں گے اس میں کوئی نہیں رہے گا۔ اور پھر لکھا ہے کہ جس طرح کے اقوال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بیان ہوئے ہیں اس قسم کے اور اقوال سلف نے صحابہ سے روایت کیے ہیں۔ مثلاً سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر رضی اللہ عنہما، جابر رضی اللہ عنہ، ابی سعید اور ایسے ہی اقوال تابعین کے بھی ہیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ اس سے اس کی صحت ثابت ہوتی ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے کہا ہے۔ اور ابن حجر اور منادی نے جو کچھ اس پر کہا ہے اس کا بودا پن ثابت ہوتا ہے اور یہی حق بھی ہے۔ اس لیے کہ ان صریح اقوال کی یہ تاویل کہ [عَصَاةُ مُوْمِنٌ] نکلیں گے اور کفار دوزخ میں ہی بھرے رہیں گے کسی طرح بھی یہ درست نہیں۔ جہنم کے دروازے بند ہو جانا، **اس میں کسی کا نہ رہنا، سب کا ایک دن نکل آنا یہ صاف بتاتا ہے کہ جہنم سے آخر کار سب نکال دیئے جائیں گے۔**

اور حدیث شفاعت بھی اسی کی مؤید ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: [شَفَعَتْ الْمَلَائِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّونَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُونَ وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنْ النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُوا خَيْرًا قَطُّ] (صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب مَعْرِفَةِ طَرِيقِ الرُّؤْيَةِ، حديث: 472) یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتے بھی شفاعت کر چکے اور نبی بھی شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور اب سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا باقی رہ گیا ہے۔ پس ایک مٹھی دوزخ سے بھرے گا اور ان سے ان لوگوں کو باہر نکال دے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہ کی تھی۔ اب اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تین قسم کی شفاعت ہے۔ مومنوں کی، نبیوں کی، فرشتوں کی۔ ظاہر ہے کہ مومنوں کی شفاعت بہت محدود ہے صرف اپنے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے، اس سے بڑھ کر انبیاء کی شفاعت ہے اور وہ اپنی امتوں کے لیے، اس کے بعد فرشتوں کی شفاعت ہے اس کا دائرہ بھی اس سے بھی وسیع ہے کیونکہ وہ تمام نیکی کرنے والوں کے لیے ہے۔ اور ارحم الراحمین ایک ایسی قوم کو نکالے گا جس کا تعلق نہ کسی مومن سے تھا، نہ کسی نبی سے، نہ نیکی کے محرک فرشتوں سے اور اس لیے انہوں نے کبھی کوئی نیکی نہ کی تھی اور خدا کی مٹھی سے باہر کون رہ جائے گا ﴿وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ [الزمر: 67:39] ''اور زمین سب قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔''

اور اس کے بالمقابل خُلُوْدٌ اور اَبَدٌ کی بحث بے سود ہے۔ اس لیے کہ جو خلود اور ابد عصاۃ مسلمین کے لیے ہے وہی کفار کے لیے ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ جو بات ایک کو مستثنیٰ کر سکتی ہے وہی دوسرے کو۔ اور اصل بات یہ ہے کہ خلود کے لیے [دیکھو نمبر: 39] ہمیشگی لازم نہیں بلکہ یہ بقائے طویل کا نام ہے۔ رہا لفظ ابد، سو مفردات میں [تَأَبَّدَ الشَّيْءُ] کے معنی میں لکھا ہے:

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور وہ اس کے بارے میں سخت شک میں ہیں۔ (1507)

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور یقیناً تیرا رب سب کے سب کو ان کے عمل پورے پورے دے گا کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اس سے خبردار ہے۔ (1508)

[وَ يُعَبَّرُ بِهِ عَمَّا يَبقٰى مُدَّةً طَوِيلَةً] یعنی اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جو مدت طویل تک باقی رہے اور پھر ابد کی جمع آباد زبان عربی میں آتی ہے حالانکہ اگر اس کے معنی ہمیشگی ہوتے تو جمع نہ ہوسکتی تھی اور اس طرح اس کی تاکید بھی آتی ہے: [اَبَدٌ اَبَدٍ وَ اَبِيْدٍ] حالانکہ اگر غیر محدود زمانہ اور ہمیشگی لازماً اس کے معنی میں ہوتی تو تاکید بھی نہ آ سکتی تھی اور امام راغب لکھتے ہیں کہ حق یہ تھا کہ ابد جمع کوئی نہ آتی کیونکہ یہ تصور نہیں آ سکتا کہ ایک اَبَدٍ کے ساتھ دوسرا ابد ملایا جا سکے۔ لیکن آباد کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کو اس کے ایک حصہ کے لیے خاص کر لیا گیا ہے جو اس میں شامل ہے۔ جیسا کہ اسم جنس کو اس کے بعض سے خاص کر لیا جاتا ہے۔ گو غیر محدود زمانہ کا حصہ کوئی نہیں کہلا سکتا، تاہم اس توجیہہ کا بھی صاف مطلب یہ ہے کہ ابد کے لفظ کا استعمال محدود لمبے زمانہ پر بھی ہوسکتا ہے اور غیر محدود زمانہ پر بھی۔ اگر غیر محدود زمانہ بھی اس مراد لیا جائے تو بھی ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ کے استثنا نے دوزخیوں کو اس سے باہر نکال دیا ورنہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف نے دوسری جگہ ﴿لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ [النبأ: 23:78] ''اس میں برسوں رہیں گے۔'' کہہ کر یہ صاف بتا دیا کہ دوزخ کا ابد بھی ایک محدود زمانہ ہے۔ برخلاف بہشت کے ابد کے کہ اس کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں فرمایا جو محدود زمانہ پر ہی بولا جا سکتا ہو۔ جیسا کہ اَحْقَاب ہے جو حَقَبَةٌ کی جمع ہے اور دوسرے بہشت کو ابدیت ﴿عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ قرار دے کر بھی واضح کر دیا کہ یہ نعما ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔

1507 - حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پچھلی سورت میں ہو چکا ہے اس لیے یہاں صرف اسی پر اکتفا کیا ہے۔ غرض وہی ہے جو دوسرے انبیاء کے ذکر میں ہے یعنی آنحضرت ﷺ کو تسلی دینا۔ [اِخْتِلَافٌ فِي الْكِتَابِ] کے لیے [دیکھو نمبر:214]۔ اور وہ بات جو پہلے ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی سزا میں بوجہ اپنے رحم عظیم کے تاخیر کرتا رہتا ہے جیسا کہ [آیت:119، نوٹ:1514] میں وضاحت کر دی ہے۔

1508 - كُلًّا میں تنوین مضاف الیہ کے قائم مقام ہے یعنی سب اختلاف کرنے والے یا سب کے سب مومن ہوں یا کافر۔

لَمَّا کا استعمال کلام عرب میں کئی طرح پر ہے۔ حین یعنی وقت کے معنی میں ﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ﴾ [القصص: 23:28] ''اور جب مدین کے پانی پر پہنچا۔'' ﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ﴾ [الصافات: 102:37] ''سو جب وہ اس کے ساتھ کام کاج (کی عمر) کو

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

سو سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی جو توبہ کر کے تیرے ساتھ ہوا اور حد سے نہ بڑھو جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ (1509)

پہنچا۔'' یعنی جب ایسا ہوا۔ اور لَمَّ جازمہ کے معنی ہیں یعنی صرف نفی کے لیے جیسے ﴿بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ﴾ [صٓ: 8:38] ''بلکہ انہوں نے میرا عذاب نہیں چکھا۔'' ﴿وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ [التوبة: 16:9] ''اور اللہ نے تم میں سے ان کو ابھی الگ نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا۔'' اور اِلَّا کے معنی میں ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝﴾ [الطارق: 4:86] جس کے معنی ہیں کوئی نفس نہیں مگر اس پر حافظ ہے یا ﴿وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝﴾ [يٰسٓ: 32:36] ''اور کل ہاں سب کے سب ہی ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے۔'' یعنی [مَا كُلٌّ اِلَّا جَمِيْعٌ] کوئی نہیں مگر سب کے سب ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے۔ گویا یہ لَمَّ اور مَا سے مرکب ہے جیسے اِلَّا، اَنْ اور لَا سے دو نفیوں کا اجتماع ہے جو دونوں مل کر اور ایک لفظ ہو کر نفی کی حد سے نکل گئے اور اس کے معنی اِلَّا ہونے پر بطور شہادت یہ آیت قرآنی بھی پیش کی گئی ہے ﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾ [صٓ: 14:38] ''سب کے سب نے ہی رسولوں کو جھٹلایا۔'' اور کبھی کسی چیز کے انتظار کے لیے آتا ہے جس کے ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ (ل)

یہاں اگر اِنْ كُلٌّ ہوتا جو نافیہ ہے تو لَمَّا کے معنی اِلَّا لے کر ترکیب درست ہو جاتی مگر یہاں [اِنَّ كُلًّا] ہے۔ تو بعض نے اس صورت میں بھی معنی اِلَّا ہی لیے ہیں اور بعض نے لِمَنْ مَّا اس کا اصل قرار دیا ہے یعنی کوئی بھی ہو جس میں نون کو میم سے تبدیل کر کے تین میموں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے ایک حذف کیا گیا اور باقی دو میں سے ایک دوسرے میں مدغم ہو گیا۔ (ل) اور بعض نے یوں توجیہہ کی ہے کہ لَمَا یہاں بغیر تنوین وہی معنی رکھتا ہے جو لَمَّا تنوین کے ساتھ۔ یعنی تنوین صرف قرأت میں حذف ہو گئی ہے اور مراد لَمَا ہے اور لَمَّا کے معنی ہیں جمع کر کے جیسے ﴿وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝﴾ [الفجر: 19:89] ''اور میراث سب کچھ سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔'' جس کا مادہ لَمّ ہے جس کے معنی ہیں [اَلْجَمْعُ الْكَثِيْرِ الشَّدِيْدِ] یعنی کثرت اور شدت سے جمع کرنا۔ (ل) تو یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا اجر انہیں پورا پورا دیا جائے گا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ سب کے سب۔ یہ مضبوط بات اور حق ہے کہ ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا انہیں ملے گا۔

1509 - اسْتَقِمْ۔ انسان کی استقامت یہ ہے کہ مستقیم یعنی سیدھی راہ پر لگا رہے۔ (غ) یعنی کسی حال میں اس سے ادھر ادھر نہ ہو۔

صحابہؓ کی استقامت:

اس آیت میں نہ صرف نبی کریم ﷺ کو حکم ہے کہ آپ کسی صورت میں صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہوں بلکہ یہ بھی ساتھ ہی حکم ہے کہ آپ کے ساتھی بھی جادۂ مستقیم سے ذرہ بھر انحراف نہ کریں۔ بغیر اس استقامت کے وہ کامیابیاں جن کا وعدہ دیا گیا ہے میسر نہیں آ سکتیں۔ نبی اپنی ذات میں تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے دکھاتا ہے بلکہ کتاب کی تعلیم عمل کے رنگ میں لا کر

وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝۱۱۳

اور ان کی طرف نہ جھکو جو ظالم ہیں ورنہ تمہیں آگ چھو جائے گی اور اللہ کے سوائے تمہارے کوئی حمایتی نہ ہوں گے پھر تمہیں مدد بھی نہیں ملے گی۔ (1510)

دکھاتا ہے لیکن ساتھیوں کا بھی اس استقامت کی راہ پر چلنا بہت ہی دشوار امر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [شَيَّبَتْنِي هُودٌ] (سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب وَمِنْ سُورَةِ الْوَاقِعَةِ، حدیث:3609) یعنی سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ ساتھیوں کو اس راہ پر قائم کرنا یہ ایک نہایت ہی دشوار امر تھا۔ کتنے انبیاء ہیں کہ ان کے ساتھیوں نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہتے ہیں ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ [المآئدۃ: 24:5] ''پس تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے حواریوں کو کہا کہ آج کی رات میرے ساتھ مل کر دعا ہی کرو تو وہ اس سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ مگر یہ فخر سرور دو عالم ﷺ کے حصہ میں ہی آیا کہ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے صراط مستقیم پر ایسا لزوم اختیار کیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ہر عمل میں صرف قرآن شریف کو ہی اپنا ہادی بناتے تھے اور اس کی تعلیم سے ایک بال بھر انحراف کو بھی آگ میں گرنے کے برابر سمجھتے تھے۔ علاء بن عبداللہ کا قول ہے کہ ﴿لَا تَطْغَوْا﴾ میں جو خطاب ہے اس سے مراد اصحاب النبی ﷺ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ (فتح البیان)

﴿وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ یہاں جس بات میں معیت کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری یا اس کے اوامر اور نواہی پر استقامت ہے اور تاب سے مراد ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور یوں رجوع کر کے رسول اللہ ﷺ کی معیت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو قبول کیا۔ جس طرح خود مامور یعنی نبی کریم ﷺ نے انہیں قبول کیا تھا۔ پس یہاں نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی معیت ہے۔ بلکہ وہ معیت بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر استقامت میں ہے یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے۔ اس سے صحابہ کے مقام بلند پر شہادت ملتی ہے کہ **طاعۃ اللہ میں وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں تھے**۔ جو نادان نبیوں کی معیت [النسآء: 69:4] سے مراد نبی ہونا مراد لیتے ہیں وہ ان الفاظ پر غور کریں کہ یہاں خود سرور دو عالم کی معیت آپ کے برگزیدہ اصحاب کو حاصل ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ سب خاتم النبیین بن گئے تھے۔

1510 - ﴿الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ سے مراد مشرک اور رکن یا میلان سے مراد ان سے محبت قلبی یا ان کے افعال پر راضی ہو جانا خیال کیا گیا ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ یہ باتیں بھی اس کے اندر آ جاتی ہیں اور الفاظ قرآنی میں عمومیت اور وسعت ہے۔ جب پہلی آیت میں طاعۃ اللہ پر استقامت کا حکم دیا اور ہر قسم کے ظلم یا طغیان سے روکا تو یہاں اور بھی ترقی کی یعنی نہ صرف انسان ہر قسم کے ظلم سے بچے بلکہ **ظالم کی طرف میلان** سے بھی بچے۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور دن کی دونوں طرفوں میں اور پہلی رات نماز کو قائم رکھ کیونکہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔ (1511)

وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور صبر کر کیونکہ اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

ماسوی اللہ کا سہارا:

چونکہ ان سورتوں کے نزول کا زمانہ اسلام اور مسلمانوں پر سخت ترین مصائب کا زمانہ تھا اور مصائب میں انسان ہر قسم کا سہارا تلاش کرتا ہے اس لیے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ ان تکالیف میں تم کفار کی طرف جھک کر ان مصائب سے نکلنے کا خیال کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ولایت تمہارے لیے نہ ہوگی۔ آج بھی مسلمانوں کو اس ہدایت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ بجائے طاعۃ اللہ پر استقامت کے دوسرے لوگوں کے سہارے تلاش کرتے ہیں اور یہ سہارے ایک ایک کر کے گرتے چلے جاتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا نہیں بناتے اس لیے ناکامی پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

1511 - **اوقاتِ نماز:** ﴿طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ طرف ایک جانب کو کہتے ہیں۔ وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے یا اور رنگ میں۔ (غ) اور نہار عرف شریعت میں طلوع فجر یعنی پو پھٹنے سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے۔ (غ) پس اس کی طرفین یا دو طرفیں طلوع آفتاب سے پہلے اور زوال آفتاب کے بعد کے اوقات ہوئے۔ جیسا کہ خود اس کی تشریح دوسری جگہ فرما دی ہے ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ [بنی إسرائیل: 78:17] ''سورج کے ڈھلنے سے (شروع کر کے) رات کے اندھیرے تک نماز کو قائم رکھ اور صبح کے قرآن کو (بھی)۔'' یعنی فجر کو ایک جانب اور آفتاب کے ڈھلنے کو دوسری جانب قرار دیا ہے۔ پس ﴿طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ میں نماز فجر، ظہر اور عصر آئیں گی۔

زُلَفًا۔ زُلَف اور زُلْفٰی اور زُلْفَةٌ کے معنی قریب ہونا اور مرتبہ ہیں ﴿وَ مَآ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى﴾ [السبأ: 37:34] ''اور نہ تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد وہ چیز ہے جو مرتبہ میں تمہیں ہمارے قریب کرے۔'' ﴿وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [الشعرآء: 90:26] ''اور جنت کو متقیوں کے قریب کیا جائے گا۔'' ﴿وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ﴾ [الشعرآء: 64:26] ''اور وہیں ہم دوسروں کو قریب لے آئے۔'' ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً﴾ [الملك: 27:67] ''سو جب اُسے قریب دیکھیں گے۔'' اور [مُزْدَلِفَةٌ] جو مکہ معظّمہ میں ایک مقام کا نام ہے وہ بھی قرب کے معنی کے لحاظ سے ہی ہے کیونکہ عرفات سے نکلنے کے بعد اس مقام پر پہنچ کر منیٰ سے حاجی قریب ہو جاتے ہیں اور زُلَف زُلْفَةٌ کی جمع ہے اور رات کی پہلی گھڑیوں پر جو دن سے قریب ہیں یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ﴿زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ [هود: 114:11] ''پہلی رات کو۔'' مغرب اور عشا کی نمازوں کے اوقات ہیں۔ (ل)

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

پھر کیوں تم سے پہلی نسلوں میں اچھے عملوں والے لوگ نہ ہوئے جو ملک میں فساد سے روکتے، ہاں تھوڑے سے ان میں سے جنہیں ہم نے بچایا (ایسے تھے) اور جو ظالم تھے وہ ان آسائشوں کے پیچھے پڑے رہے جو انہیں دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے۔ (1512)

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور

جب ظالموں کی طرف جھکنے سے روکا تو ساتھ ہی بتایا کہ اللہ کی طرف جھکو اور نماز اس کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے مصائب میں نماز سے استعانت کا بار بار ذکر کیا ہے۔ بظاہر خیال ہوسکتا ہے کہ نماز کو مصائب سے نجات سے کیا تعلق ہے۔ مگر اس کی حقیقت کو ایک مؤحد ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح جب انسان تمام سہاروں کو چھوڑ کر ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا بناتا اور اس کے آگے گرتا ہے تو وہ جو تمام طاقتوروں سے بڑھ کر طاقتور ہے اس کا ہو جاتا ہے۔ اگلی آیت میں صبر کا حکم اسی حقیقت کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ یہاں پانچوں نمازوں کا بھی ذکر کر دیا ہے ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بھلائی کے اختیار کرنے سے انسان دکھوں اور تکلیفوں سے نجات پا جاتا ہے اور نماز حسنات کا رستہ کھولتی ہے۔ اور ان الفاظ میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون بھی بیان فرمایا ہے کہ **بدی کا کفارہ نیکی** ہے جب انسان نیکی کو اختیار کرتا ہے تو اس کی بدیاں دور ہو جاتی ہیں۔ بدی کو دبانے والی نیکی کی طاقت ہے۔ اس لیے کہ نیکی اور بدی ایک ہی قویٰ کے اچھے اور برے استعمال کا نام ہے۔ جب انسان ان قویٰ کو صحیح موقعہ پر لگانا سیکھ لے گا تو بدی خود ہی دور ہو جائے گی۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیکی کی قوت اس قدر زبردست ہے کہ بدی کی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

1512 - ﴿اُتْرِفُوْا﴾۔ تَرَفَ کے معنی تنعم یا آسودگی ہیں اور مترف وہ ہے جسے فراخی اور آسودگی متکبر کر دے۔ (ل) ﴿وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ﴾ [الأنبیآء: 13:21] ''اور اس کی طرف لوٹ جاؤ جس میں تم عیش کرتے تھے۔'' ﴿اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ﴾ [المؤمنون: 64:23] ''ہم ان کے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے۔'' ﴿اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا﴾ [بنی إسرائیل: 16:17] ''اس کے آسودہ حال لوگوں کو حکم بھیجتے ہیں۔''

گویا اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ایسے عقلمند ان میں کیوں نہ ہوئے کہ وہ لوگوں کو فساد سے روکتے جس سے معلوم ہوا کہ تباہی زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے آتی ہے۔ ظالم لوگ آسائش دنیوی کے پیچھے پڑ کر ظلم میں یہاں تک ترقی کرتے ہیں کہ آخر مجرم کی سزا کی نوبت آ جاتی ہے۔

اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

ان کے رہنے والے نیکوکار ہوں۔ (1513)

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی گروہ کر دیتا اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۱۹﴾

مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اسی کے لیے اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی بات پوری ہوگئی میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ (1514)

1513 - اس کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو محض ان کے شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا۔ اگر وہ ملک میں فساد پھیلانے والے نہ ہوں۔ گویا کسی قوم کو ہلاک اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ زمین میں شرارت اور فساد اور ظلم میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ محض عقائد باطلہ کی وجہ سے نہیں۔

1514 - **پیدا کرنے کی غرض رحم کرنا ہے:** اس سے پہلی آیت میں بیان فرمایا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی گروہ بنا دیتا یعنی ان میں کوئی اختلافات نہ ہوتے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نے انسان کو کچھ قویٰ دے کر ان کے استعمال کا اسے اختیار دیا ہے اس لیے وہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے۔ یعنی احکام الٰہی کے بارہ میں اختلاف کریں گے۔ جس سے مراد ان کی مخالفت ہے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ لوگ مخالفت نہیں کرتے جن پر تیرے رب نے رحم کیا یعنی مومن یا اہل حق اور اس سے آگے جو لفظ آتے ہیں ﴿وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ اسی لیے انہیں پیدا کیا۔ تو گو ابن جریر نے دونوں قسم کی روایتیں جمع کی ہیں یعنی بعض اقوال کی رو سے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختلاف کے لیے پیدا کیا اور بعض کی رو سے یہ کہ انہیں رحم کے لیے پیدا کیا۔ مگر پہلے معنی کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے نہیں ہوتی۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ اختلاف کرتے رہیں۔ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ [الذاریات: 56:51] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' تو غرض حقیقی تو یہی ہے کہ وہ عبادت کریں اور یہ اس کے ہم معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔ یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ان کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کریں۔ اور پھر صاف الفاظ میں فرمایا ﴿وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ [الأعراف: 156:7] ''اور میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔'' پس جب رحمت ہر چیز پر ہے تو معلوم ہوا کہ اسی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ابن کثیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول منقول ہے [لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ] یعنی رحمت کے لیے پیدا کیا ہے عذاب کے لیے پیدا نہیں کیا۔ اور حدیث میں ہے میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رحم کے لیے ہی پیدا کیا ہے تو آخر کار سب پر رحم ہی ہوگا اور یہ اس کے مطابق ہے جو [نمبر:1506] میں دکھایا گیا ہے کہ دوزخ پر آخر فنا آئے

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور سب جو ہم رسولوں کے حالات سے تجھ پر بیان کرتے ہیں اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور اس میں تیرے پاس حق آ گیا اور (وہ) مومنوں کے لیے وعظ اور نصیحت (ہے)۔ (1515)

وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور جو ایمان نہیں لاتے انہیں کہہ دے اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم بھی کام کرتے ہیں۔ (1516)

وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع 10 14 10

اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں سو اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسا کرو اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

گی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **دوزخ بھی اللہ تعالیٰ کے رحم کا ایک رنگ اپنے اندر رکھتا ہے**۔ جس طرح یہاں مصائب میں پڑ کر انسان آرام پاتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو یہاں آسائش جسمانی کے درپے رہتے ہیں ان کے لیے ایک اور قسم کے دکھوں میں سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا رحم حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک پھوڑے کا چیرنا، پھاڑنا بیمار کو عذاب کے رنگ میں نظر آتا ہے۔ مگر طبیب جانتا ہے کہ ایسی حالت میں یہی رحم ہے، یہی حالت عذاب نار کی ہے۔ اسی لیے یہ فرما کر کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کے لیے انسانوں کو پیدا کیا ہے اس کے بعد فرمایا کہ دوزخ کو بھی جنوں اور انسانوں سے بھرا جائے گا۔ تو اس کی غرض بھی وہی ہے۔

1515 - یہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص کی غرض نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ گویا ان انبیاء کے حالات میں اور ان کے مخالفین کی ہلاکت میں نبی کریم ﷺ کے حالات اور آپ کے مخالفین کی ہلاکت کو بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے۔ ﴿فِيْ هٰذِهِ﴾ سے مراد یہ سورت ہے یا ان حالات کا بیان۔

1516 - نرے عقائد، نرے لفظ، نرے دعاوی سے کچھ نہیں ہوتا ﴿اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ﴾ اسی میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے۔ عمل سے ہی انسان بنتا ہے، عمل سے ہی قوم زندہ ہوتی ہے۔ آج عمل کو چھوڑ کر ہی مسلمان موت کی حالت تک پہنچ گئے ہیں اگر زندہ ہوں گے تو پھر عمل سے ہی زندہ ہوں گے۔

سورہ یوسف

نام:

اس سورت کا نام یوسف ہے اور اس میں 12 رکوع اور 111 آیتیں ہیں۔ اس کا نام حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ سے لیا گیا ہے جو اس کا واحد مضمون ہے۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت کا مضمون ایک ہی ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر سوائے اس کے کہ ابتدا میں یہ بتادیا ہے اس ذکر کی اصل غرض کیا ہے اور آخر میں بالوضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو توجہ دلائی ہے۔

① پہلے رکوع میں حضرت یوسف علیہ السلام کے رؤیا کا ذکر ہے کہ اسے ایک عظیم الشان انسان بنایا جائے گا اور اس میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور باطنی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

② دوسرے رکوع میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے یوسف سے سلوک کا ذکر ہے۔ اس سے بہت بڑھ کر برا سلوک اور خطرناک منصوبے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوئے۔

③ تیسرے رکوع میں ذکر ہے کہ کس طرح، طرح طرح کی ترغیبات کے اندر حضرت یوسف علیہ السلام نے استقامت دکھائی اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت کا ذکر ہے۔ کیونکہ اسی قسم کی ترغیبات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی پیش کی گئی تھیں۔

④ چوتھے رکوع میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قید میں پڑنے کا ذکر ہے اور گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ رکھا مگر شعب ابی طالب میں یہ مشابہت بھی پوری ہوگئی۔

⑤ پانچویں رکوع میں ذکر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حالت قید میں بھی جب موقعہ ملا تو وعظ و نصیحت کو نہیں چھوڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شعب میں محصور ہونے کے زمانہ میں بنو ہاشم میں اپنے سلسلہ وعظ و نصیحت کو جاری رکھا اور انہی ایام میں ان لوگوں میں سے بہتوں کے دلوں میں اسلام گھر کر گیا۔

⑥ چھٹے رکوع میں شاہ مصر کی خواب کا ذکر ہے جس میں سات سال کے قحط کا ذکر ہے اور اس کی تفسیر خود بخاری میں اس سات سال کے قحط کا حوالہ دیا گیا ہے جو مکہ میں ہوا۔

⑦ ساتواں رکوع حضرت یوسف علیہ السلام کی بریت اور عزت کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بریت ہوئی اور مدینہ میں سب

قوموں نے آپ کو اپنا حکم قرار دیا۔

⑧،⑨ آٹھویں اور نویں رکوع میں حضرت یوسف علیہ السلام اور آپ کے بھائیوں کے باہمی معاملات کا ذکر ہے۔عرب میں قحط کے وقت جب ابوسفیان نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ آپ کے بھائی بند ہلاک ہو رہے ہیں تو آپ نے بھی دعا کی اور آپ کی دعا سے قحط دور ہوا۔

⑩ دسویں رکوع میں بھائیوں کا اعتراف اور حضرت یوسف علیہ السلام کی معافی کا ذکر ہے اور نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے وقت وہی لفظ ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ دہرا کر ان کو بتایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں آپ کا ہی نقشہ کھینچا گیا تھا۔

⑪ گیارھویں رکوع میں یہ ذکر ہے کہ کس طرح وہی بھائی آخر مصر میں آ کر حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت میں شریک ہوئے اور یہ اشارہ تھا کہ عرب کے لوگ بھی آخر اس عظیم الشان حکومت کے وارث ہوں گے جو نبی کریم ﷺ کے طفیل ان کو ملے گی۔

⑫ بارھویں رکوع میں مضمون کو عام کر کے آپ کے مخالفین کو توجہ دلائی ہے۔

تعلق:

الٓرٰ کے مجموعہ میں یہ تیسری سورت ہے جب پچھلی دو سورتوں میں پہلے علمی بحث سے اور پھر انبیائے سابق کے مخالفین کے انجام کا ذکر کر کے آنحضرت ﷺ کے مخالفین کو سمجھایا تو اب یہاں بالخصوص ایک ایسے نبی کا ذکر کیا جس کے حالات کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ اور آپ کے مخالفین کے حالات کی کھلی کھلی مشابہت پیش آنے والی تھی اور پچھلی سورت کے آخر میں بتایا تھا کہ ذکر انبیاء میں آنحضرت ﷺ کا ہی ذکر ہے۔

زمانہ نزول:

سورت کی آخری اور پہلی آیت بالصراحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ کا ہے جب قریش کی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی اور لوگوں نے آپ کے وعظ و نصیحت کی طرف بالکل توجہ چھوڑ دی۔جس کے بعد نصرت الٰہی کا اس رنگ میں ظہور ہوا کہ آپ کے لیے مدینہ میں ایک مضبوط جماعت کھڑی ہو گئی۔

اٰیَاتُھَا 111 (12) سُوْرَۃُ یُوْسُفَ مَکِّیَّۃٌ (53) رُکُوْعَاتُھَا 12

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ ۟ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۟ﶜ ① — میں اللہ دیکھتا ہوں، یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ② — ہم نے یہ قرآن عربی میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔(1516)

1516۔ ﴿عَرَبِيًّا﴾۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو عَرَبْ کہا جاتا ہے اور عَرَبِیٌّ کے معنی مُفْصِحٌ یعنی فصاحت سے بیان کرنے والا ہیں اور اِعْرَابٌ کے معنی بیان ہیں اور حدیث میں ہے: [اَلثَّيِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِهَا] (مسند أحمد، جلد29، صفحہ 260) یعنی بیوہ خود بات کو کھول کر بیان کر دے یعنی رضامندی نکاح کے معاملہ میں۔ اور عَرَبِیٌّ فصیح واضح کلام کو کہا جاتا ہے جیسے یہاں۔ یا ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ [الشعرآء: 195:26] ''کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں۔'' یا ﴿حُكْمًا عَرَبِيًّا﴾ [الرعد: 37:13] جہاں معنی کیے گئے ہیں فصاحت سے بیان کرنے والا جو حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے اور بعض نے اس کے معنی شریف کریم کیے ہیں جیسے دوسری جگہ ﴿كِتٰبٌ كَرِيْمٌ﴾ [النمل: 29:27] ''معزز خط۔'' فرمایا اور یا عَرَبِیٌّ کے معنی ہیں نبی عربی کی طرف منسوب۔ (غ) اور عَرَبْ عَجَمْ کے خلاف ہے اور اَعْجَمْ وہ شخص ہے جس کی زبان میں عُجْمَۃٌ یعنی ابہام ہو خواہ وہ عربی ہو یا غیر عربی۔ اسی معنی میں ہے ﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا﴾ [حٰمٓ السجدۃ: 44:41] ''اور اگر ہم اسے عجمی قرآن بناتے۔'' (غ)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی۔ (ر) اس صورت میں <u>عربی ام الالسنۃ</u> یعنی سب زبانوں کی ماں قرار پائے گی اور اسی کے موافق بعض کا مذہب ہے کہ عربی سب سے پہلی لغات ہے اور دوسری سب زبانیں اس کے بعد پیدا ہوئیں۔ (ر) اور ایک حدیث میں ہے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ پس اگر قرآن عربی سے مراد عرب کی زبان میں نازل ہونا لیا جائے تو ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ یہ زبان جوام الالسنۃ ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام نازل ہوا اور یہ عجیب بات ہے کہ کم از کم گزشتہ تیرہ چودہ سو سال کی زبان عربی جو علمی رنگ میں استعمال ہوتی تھی اس میں آج تک کچھ بھی فرق نہیں آیا اور تیرہ سو سال بعد وہی زبان علمی ہے جو اس وقت عرب میں تھی۔ حالانکہ دوسری زبانیں اس سے نصف وقت میں بھی اس طرح تغیر سے پاک نہیں رہیں جس سے اس بات پر شہادت ملتی ہے یہ کہ زبان ابتدا سے اسی حالت میں رہی ہے۔ عربی کے ام الالسنۃ ہونے پر مفصل بحث کے لیے دیکھو کتاب ام

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

ہم اس قرآن کی تیری طرف وحی کرنے سے تجھے نہایت اچھا بیان سناتے ہیں گو تو اس سے پہلے بے خبروں میں سے تھا۔ (1516)ب

الالسنۃ جو خواجہ کمال الدین صاحب کی تصنیف ہے اور اس کی طرف اس زمانہ میں توجہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے دلائی ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں **قرآن عربی سے مراد** وہ کتاب ہے جو اپنے مضامین کو کھول کر اور فصاحت سے بیان کرتی ہے تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ جو کوئی شخص چاہے قرآن کریم کا مقابلہ دوسری مذہبی کتابوں سے کر کے دیکھ لے کہ جس طرح کھول کر یعنی مدلل طور پر اور بایں فصاحت سے قرآن کریم نے مضامین کو بیان کیا ہے اس سے دوسری کتابوں کو نسبت ہی نہیں۔

1516ب- قَصَصِ کے لیے [دیکھو نمبر: 454]۔ قَصَصِ کے معنی بیان ہیں یا وہ خبر جو بیان کی جائے اور قِصَّةٌ کی جمع قِصَصٌ ہے اور ﴿اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ کے معنی [اَحْسَنَ الْبَيَانَ] ہیں یعنی نہایت اچھا بیان۔ (ل)

﴿الْغٰفِلِيْنَ﴾۔ غَفْلَةٌ بھول جانا ہے جو یادداشت یا احتیاط کی کمی سے انسان کے لازم حال ہوتا ہے۔ (غ) یا اس چیز کا احساس نہ ہونا جس کا احساس ہونا چاہیے یا کسی چیز سے ذہول۔ (ت)

اس ذکر کو جو اس سورت میں ہے **نہایت عمدہ بیان** کہا ہے۔ اس لیے کہ گو یہ محض ایک انسان کی زندگی کے تھوڑے سے حالات کا بیان ہے مگر اول سے لے کر آخر تک اعلیٰ درجہ کے اخلاقی سبقوں سے بھرا پڑا ہے اور علاوہ ازیں یہ گویا نبی کریم ﷺ اور آپ کی قوم کے تعلقات کا مرقع ہے اور اسی کی طرف ﴿وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝﴾ میں اشارہ ہے۔ گو یہ الفاظ ظاہر معنی میں بھی درست ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے نہ ان ذکروں کو کہیں سے سنا تھا اور نہ ان کتابوں کو پڑھا تھا اور صرف وحی کے ذریعہ سے آپ پر ان حالات کا انکشاف ہوا۔ مگر قرآن کے لیے ظہر و بطن دونوں ہیں اور اس ظاہری معنی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ ابھی تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری قوم تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کرے گی اور اس طرح تم کو گھر سے نکالا جائے گا اور کسی دوسرے مقام پر پہنچ کر تمہیں وہ عزت کا مقام ملے گا جس کے سامنے تمہاری قوم کو آخر اسی طرح سر جھکانا پڑے گا جس طرح یوسف کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے جھکایا۔ **ان حالات کا آنحضرت ﷺ کے حالات سے مطابق ہونا** اور آپ کی زندگی کا نقشہ اس سورت میں کھینچا جانا خود نبی کریم ﷺ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے جو آپ نے اپنی قوم کے آخر کار اظہار عاجزی پر فرمائے ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (شرح معانی الآثار، جلد3، صفحہ325، حدیث:5454) جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو کہے تھے۔ اور اس آیت کے اندر جو الفاظ بظاہر زائد معلوم ہوتے ہیں ﴿بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ﴾ [92] یعنی اس قرآن کی وحی کے ذریعہ سے، تو ان کی غرض یہ ہے کہ یہ قصہ نہیں کیونکہ قرآن شریف قصوں سے پاک ہے بلکہ اس کی غرض اخلاق کی تعلیم ہے۔ اور جس رنگ میں یہ تذکرہ بائبل میں مذکور ہے اگر اس کے ساتھ ہی اس کا

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝۴	جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا، میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کرتے ہیں۔ (1516)ج
قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵	اس نے کہا اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لیے کوئی مخفی تدبیر کریں گے۔ کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔
وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ	اور اسی طرح تیرا رب تجھے چن لے گا اور تجھے باتوں کی

مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں اول سے آخر تک اس تذکرہ سے ایسے اخلاق سکھائے گئے ہیں جو بائبل میں نہیں پائے جاتے اور اسی لیے بائبل کے ساتھ کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔ گویا بتا دیا ہے کہ اگر یہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے نہ سکھایا گیا ہو تو محض بائبل کی نقل ہوتی۔

1516ج- اَبَتِ۔ اصل میں اَبِیْ ہے میرے باپ اور یا کو تائے تانیث سے بدلا گیا ہے۔

رَاَیْتُ کے معنی یہاں ہیں خواب میں دیکھا۔ ماضی دونوں معنوں میں آتی ہے خواب میں دیکھنا معنی ہو تو مصدر رُؤْیَا آتا ہے ویسے دیکھنے کے معنی میں رُؤْیَۃٌ مصدر ہے۔

کَوْکَبٌ۔ نَجْمٌ یعنی ستارہ کو کہتے ہیں اور نور کو اس کے ساتھ تشبیہ کی وجہ سے بھی کَوْکَبٌ کہہ دیا جاتا ہے اور سردار قوم کو بھی کوکب کہا جاتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے رؤیا سے آپ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قبل از نبوت سچے خواب آتے تھے اور آپ کے خواب فلق الصبح کی طرح سچے ہوتے تھے۔ **گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کا سجدہ کرنا** کسی تمثل کے رنگ میں ہوگا۔ کیونکہ سجدہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ماتھا زمین پر رکھا جائے۔ سو یہ چیزیں اپنی اصل ہیئت میں ایک انسان کی رویت میں اس مفہوم کو پورا نہیں کر سکتی۔ پس یا تو ان چیزوں نے انسان کا تمثل اختیار کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا اور یا یہ سجدہ کسی رنگ کا اظہار فرمانبرداری تھا جس کی کوئی تصریح یہاں موجود نہیں۔ اس خواب کی تعبیر کیا تھی اس کا ذکر اگلی آیت میں اور پھر سورت کے آخر میں آتا ہے اور گیارہ ستاروں کے نام جو ایک حدیث میں دیئے ہیں تو ابن جوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ع 1 6 11

حقیقت سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور یعقوب کی اولاد پر پوری کرے گا۔ جیسے اس نے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق پر اسے پورا کیا۔ تیرا رب جاننے والا حکمت والا ہے۔ (1516)د

1516د- اَحَادِيْثِ۔ حَدِيْثٌ، حَدَثٌ سے ہے اور حُدُوْثٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا ہونا بعد اس کے کہ وہ نہ تھی۔ اور حَدِيْثٌ ہر ایک کلام کو کہتے ہیں جو سماعت سے یا وحی سے انسان کو پہنچے، بیداری کی حالت میں ہو یا خواب میں۔ اسی لیے خود قرآن کریم کو بھی حَدِيْثٌ کہا ہے ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ﴾ [النجم: 59:53] ''تو کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو۔'' ﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ [النسآء: 87:4] ''اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے؟'' (غ)

بائبل اور قرآن میں فرق:

بائبل میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے بیان کیا تو:

''اس کے باپ نے اسے ڈانٹا اور اس سے کہا کہ یہ کیا خواب ہے جو تو نے دیکھا ہے کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کر تجھے سجدہ کریں گے۔'' [پیدائش: 10:37]

یہ کلام ایک نبی کی شان کے مطابق نہیں۔ کیونکہ وہ گویا اس خواب کو بے معنی یا جھوٹا قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کے خلاف اس کو سچا قرار دیا ہے اور اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ یوسف ایک عظیم الشان انسان ہوگا اور یہ ان واقعات کے بھی مطابق ہے جو کتاب پیدائش میں موجود ہیں۔

سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں کے سجدہ کرنے سے کیا مراد ہے؟ روح المعانی میں ہے کہ سورج کی تعبیر بادشاہ اور سونا اور زوجہ جمیلہ ہے اور قمر کی تعبیر امیر اور کواکب کی رؤسا۔ تو اس صورت میں سورج اور چاند اور ستاروں کے سجدہ سے مراد کسی بادشاہ اور امیر اور رؤسا کا آپ کی اطاعت کرنا ہوگا اور مصر میں آپ واقعی ایک بلند مرتبہ پر پہنچے کہ شاہ مصر اور اس کے رؤسا سب آپ کے سامنے جھک گئے اور سب پر آپ کو فوقیت ملی۔ اور کواکب کی تعداد یا تو اس لحاظ سے ہوگی کہ وہاں کے بڑے بڑے رؤسا یا وزراء کی تعداد گیارہ ہو اور یا محض ایک عدد کامل کے طور پر۔ مگر مفسرین زیادہ تر اس بات کی طرف گئے ہیں کہ گیارہ ستاروں سے مراد ان کے گیارہ بھائی اور شمس اور قمر سے مراد والد اور والدہ ہیں۔ مگر محض بھائیوں یا ماں باپ پر کسی شخص کی فوقیت اس قدر بلند مرتبہ کا پتہ نہیں دیتی جیسا بادشاہ یا وزرا پر فوقیت کا حاصل ہونا۔ بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو تعبیر کی ہے وہ دین اور دنیا میں بلند مراتب پر پہنچنا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝۷

بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے ذکر) میں پوچھنے والوں کے لیے نشان ہیں۔(1517)

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۚۖ۝۸

جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی تو ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔ حالانکہ ہم قوی جماعت ہیں۔ یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔(1518)

حضرت یعقوبؑ کی تعبیر:

حضرت یعقوب علیہ السلام نے تین باتوں کی خبر دی ہے اول اجتبا ءجس کے معنی کے لیے [دیکھونمبر:575]۔ مفسرین میں سے بعض نے کہا نبوت کے لیے چن لینا مراد ہے، بعض نے کہا سجود کے لیے، بعض نے اور توجیہات کی ہیں۔ (ر) مگر اجتباء کے اصل معنی کے لحاظ سے مراد اچھی صفات کا آپ میں جمع کر دینا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اجتباء نبیوں اور صدیقوں اور شہدا کے لیے ہوتا ہے۔ دوسری بات تاویل احادیث کا علم دینا ہے اور اس سے مراد بعض نے تعبیر رؤیا کو لیا ہے اور بعض نے عواقب امور کو اور بعض نے احادیث انبیاء اور کتب سابقہ کو۔ مگر جس طرح احادیث کا لفظ وسیع ہے اور اس میں رؤیا اور وحی آ جاتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی معنی میں توسیع مراد ہے۔ یعنی ہر ایک بات کی تہہ تک پہنچنا اور اعلیٰ درجہ کا فہم کا ملنا۔ اسی اعلیٰ درجہ کے علم میں تعبیر رؤیا بھی شامل ہے جو محض اس کا ایک حصہ ہے اور تیسری بات اتمام نعمت ہے اور اس سے مراد دنیا اور آخرت کی نعمت کامل جانا یا اکٹھا ہو جانا ہے۔ جیسے نبوت کے ساتھ بادشاہت یا دوسروں کی غلامی سے آزادی روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی نعمتوں کا مل جانا یہی اتمام نعمت ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سب کچھ بظاہر اس خواب سے ہی سمجھا ہے اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی بھی اطلاع دی ہو کہ یوسف ان بلند مراتب پر پہنچنے والا ہے مگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورج چونکہ اصل سرچشمہ نور ہے اس لیے اس کے سجدہ سے مراد کمال دینی ہے۔ کیونکہ انسان کے اصل فضائل دینی ہیں اور قمر چونکہ سورج سے نور مستعار لیتا ہے اس لیے مراد کمال دنیوی ہے اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کمال دینی کی طفیل حاصل ہوتا ہے اور آپ کی راستبازی اور علم ہی آپ کو حکومت تک پہنچاتے ہیں اور کواکب سے چونکہ علم حاصل کیا جاتا ہے ﴿وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ [النحل: 16:16] ''اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں۔'' اس لیے کواکب کے سجدہ سے مراد علم کا حاصل ہونا ہے۔

1517 - پوچھنے والوں سے مراد یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو دریافت کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کے لیے یوسف اور اس کے بھائیوں کے معاملہ میں نشان ہیں یعنی جو معاملہ یوسف کے ساتھ ہوا وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوگا۔ آپ کو قتل کرنے کا ملک سے باہر نکالنے کی تجویز ہوگی اور بالآخر جس طرح یوسف کے بھائی عاجزانہ حالت میں یوسف کے سامنے حاضر ہوئے اسی طرح آپ کے مخالف بھی عاجز اور مغلوب ہو کر آپ سے معافی مانگیں گے۔

1518 - ﴿عُصْبَةٌ﴾۔ عَصَبٌ پٹھوں کو کہتے ہیں۔ اور عَصَبَ کے معنی باندھنا ہیں اور عُصْبَةٌ اور عِصَابَةٌ جماعت کو کہا جاتا ہے دس سے

اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝۹

یوسف کو مار ڈالو یا اسے کسی اور ملک میں نکال دو تا کہ تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہی ہو جائے اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جاؤ۔ (1519)

قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو تا کوئی قافلہ اسے نکال لے جائے اگر تم کچھ کرتے ہو (تو یہ کرو)۔ (1520)

چالیس تک جس کا واحد کوئی نہیں۔ مفردات میں ہے: [جَمَاعَةٌ مُتَعَصِّبَةٌ مُتَعَاضِدَةٌ] یعنی ایسی جماعت جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہو اور عَصَبَةٌ ایک شخص کے بیٹوں اور باپ کی طرف سے قریبیوں کو کہا جاتا ہے اور اسی مادہ سے مشہور لفظ تَعَصُّبٌ ہے جس کے اصل معنی جمع ہو جانے کے ہیں۔ پھر کسی دوسرے فریق کے خلاف جمع ہو جانا یا ظالم یا مظلوم ہو کر اور عَصَبِيَّةٌ یہ ہے کہ ایک شخص کو عَصَبَةٌ کی مدد کے لیے بلائے اور حدیث میں ہے: [لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ] (أبوداؤد، كتاب الادب، باب فِي الْعَصَبِيَّةِ، حديث: 5123) جو شخص عصبیت کی طرف بلاتا ہے یا عصبیت کے لیے جنگ کرتا ہے (یعنی محض اپنے قریبیوں کی حمایت کے لیے اور یہ نہیں دیکھتا کہ حق کس طرف ہے) وہ ہم میں سے نہیں۔

ضَلٰلٍ کے معنی یہاں خطا فی الرائے ہیں۔ (ر) یعنی غلطی۔

یوسف کے بھائی سے مراد یہاں ان کا حقیقی بھائی ہے جس کا نام بن یامین تھا یہ دونوں ایک والدہ سے تھے۔ محض اس لیے کہ باپ کو ایک بیٹے سے زیادہ پیار ہے ان کے سینوں میں حسد کی آگ جلی، انہیں یہ شکایت نہیں کہ ہمارا باپ ہم سے محبت نہیں کرتا بلکہ یہ ہے کہ یوسف سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ یہ کوشش نہیں کرتے کہ باپ کی محبت ان سے کس طرح بڑھے۔ یہ کوشش کرتے ہیں کہ یوسف کی محبت درمیان سے اٹھ جائے۔ یہی حسد ہے جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔

1519 - ﴿اطْرَحُوْهُ﴾۔ طَرَحٌ کسی چیز کا پھینکنا اور اس کا دور کر دینا ہے۔ (غ)

﴿تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس گناہ سے توبہ کر کے پھر تم صالح بن سکتے ہو اور یا مطلب یہ ہے کہ یوسف کے درمیان سے نکل جانے سے تم اپنے امور دنیا میں سنوارنے والے ہو جاؤ گے کیونکہ باپ کی توجہ تمہاری طرف ہو گی۔

1520 - ﴿غَيٰبَتِ﴾ اس کا اصل غَيْبٌ سے ہے اور غَيَابَةٌ زمین کی پستی یا گہرائی کو کہتے ہیں۔ (غ)

﴿الْجُبِّ﴾۔ جَبٌّ کے معنی کسی چیز کا جڑ سے کاٹ دینا ہیں اور جُبٌّ اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس کی اینٹوں سے منڈیر نہ بنائی گئی ہو۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

انہوں نے کہا اے ہمارے باپ کیا وجہ ہے کہ تو یوسف کے معاملہ میں ہمارا اعتبار نہیں کرتا حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾

کل اسے ہمارے ساتھ بھیجیے کہ وہ کھائے (پیے) اور کھیلے (کودے) اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔ (1521)

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اس نے کہا مجھے اس بات سے غم ہوتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس کی طرف سے بے خبر رہو۔ (1522)

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

انہوں نے کہا اگر اسے بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم ایک قوی جماعت ہیں تو اس صورت میں بے شک ہم گھاٹے میں رہنے والے ہوں گے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ

سو جب اسے لے گئے اور اتفاق کرلیا کہ اسے کنوئیں کی

(غ) جس کی دیوار بنائی گئی ہو وہ بِئْرٌ ہے اور بعض کے نزدیک جُبٌّ ایسا کنواں ہے جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو۔ (ل)

﴿يَلْتَقِطْهُ﴾۔ لَقْطٌ اور اِلتِقَاطٌ کسی چیز کا زمین سے لے لینا ہے یعنی زمین پر پڑی ہوئی چیز کا اٹھالینا اور لُقْطَةٌ گری ہوئی چیز کو لُقِيْطٌ پھینکے ہوئے بچے کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص پالے۔

سَيَّارَةٍ۔ سَيْرٌ کے معنی چلنا اور سَيَّارَةٌ چلنے والی جماعت کو کہتے ہیں۔ (غ)

پیدائش[22:37] میں ایسا کہنے والا رُوبن تھا۔

1521 - يَّرْتَعْ۔ رَتَعَ کا استعمال اصل میں حیوانات پر ہے یعنی چرنا۔ استعارۃً انسان پر بولا جاتا ہے۔ (غ) یا بافراغت کھانا پینا۔ (ل)

1522 - اس کے لے جانے سے غم ہوتا ہے گویا ان کا دل اندر سے بول رہا تھا کہ وہ محض شرارت کے لیے یوسف علیہ السلام کو لے جا رہے ہیں۔

غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

گہرائی میں ڈال دیں اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو انہیں ان کے کام کی خبر دے گا اور وہ نہیں جانتے ہوں گے۔ (1523)

وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔

1523 - بائبل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اس وحی کا ذکر نہیں اور اتنی بات سے دونوں تذکروں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ بائبل میں یہ محض ایک کہانی کا رنگ رکھتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا گم ہو گیا اور پھر مل گیا۔ قرآن کریم میں یہ طرح طرح کے روحانی اور اخلاقی سبقوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً یہی واقعہ کہ عین اس وقت جب بھائی اپنی طرف سے یوسف علیہ السلام کا کام تمام کر چکے تھے اور کوئی امید کی جھلک باقی نہ رہی تھی اور زندگی کا خاتمہ سامنے نظر آتا تھا ایک خارجی آواز آتی ہے کہ تم پر وہ زمانہ آئے گا کہ تم انہی بھائیوں کو ان کی اس حرکت کی خبر دو گے اور تمہارا مقام اس قدر بلند ہوگا کہ ان کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ تم اس مقام پر پہنچے ہوئے ہو۔ یہ آواز نہ صرف یوسف علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان کامل پیدا کرتی ہے اور اس کو آئندہ زندگی میں مصائب کی برداشت کے قابل بناتی ہے۔ اور بڑے بڑے ابتلاؤں میں نیکی پر قائم رہنے کی قوت دیتی ہے۔ بلکہ اس ذکر کے پڑھنے والے کے اندر بھی یہی تمام باتیں پیدا کرتی ہے۔ ایک اتنے ذکر کو چھوڑ دینے سے بائبل میں یہ ذکر محض ایک قصہ رہ جاتا ہے اور قرآن کریم میں یہ ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی سبق بن جاتا ہے۔

وحی قبل از نبوت:

اس وحی کے ہونے سے یہ ضروری نہیں ہوجاتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت نبی بھی ہو گئے تھے۔ [آیت: 22] میں بتایا ہے کہ حکم اور علم روحانی بلوغ کو پہنچنے پر ملا تھا اور وہ اس واقعہ کے بہت بعد تھا۔ وحی غیر نبی کو بھی ہوجاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں اور حواریوں کو وحی ہونے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ وحی بھی قبل از نبوت ہے جس طرح ان کا رویا قبل از نبوت تھا اور اس میں محض ایک آئندہ کی خبر ہے اور آئندہ کی اخبار غیر نبی پر بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ جیسے کہ اس امت میں محدثین پر جن کے متعلق احادیث میں آتا ہے: [رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ] (صحيح البخاري، كتاب، باب، حديث: 3689م) یہ خیال کر کے کہ وحی سوائے نبی کے نہیں ہوسکتی بعض نے ﴿اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ﴾ میں مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کو لیا ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت 17 سال کی تھی مگر اس سے بھی اس ذکر کی اصل عظمت مفقود ہوجاتی ہے: ﴿وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایسی حالت میں تم ان کو یہ خبر دو گے کہ تمہارے اس مقام کی وجہ سے یہ نہ جانتے ہوں گے اور یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ تم کو ہم نے خوش خبری دی ہے تو تمہارے بھائیوں کو اس بات کی کچھ بھی خبر نہیں۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ الثلٰثۃ

کہا اے ہمارے باپ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے چلے گئے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا تو بھیڑیا اسے کھا گیا اور تو ہماری بات ماننے گا نہیں اگر چہ ہم سچے ہوں۔ (1524)

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور اس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے، اس نے کہا بلکہ تمہارے دلوں نے تمہاری ایک (بری) بات کو اچھا کر دکھایا تو نیک صبر ہی ہے اور اس پر اللہ کی ہی مدد طلب کی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ (1525)

1524 - ﴿وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم آپ کے نزدیک صادق القول بھی ہوتے تو بھی اس معاملہ میں آپ ہماری بات کا یقین نہ کرتے۔ اور جب آپ پہلے بھی ہمارے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تو ہماری بات کو آپ مانیں گے تو نہیں۔

1525 - ﴿سَوَّلَتْ﴾۔ تَسْوِيْلٌ کے معنی ہیں جس چیز کی خواہش ہو اسے نفس کا اچھا کر دکھانا اور اس کے برے پہلو کو بھی اچھے رنگ میں دکھانا ﴿اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ﴾ [محمد: 25:47] ''شیطان نے (اسے) ان کے لیے اچھا کر کے دکھایا۔'' اور [سُوَّلَ اُمْنِيَّةِ] کے قریب قریب ہے۔ فرق یہ ہے کہ اُمْنِيَّةٌ اُمْنِيَّةِ یا آرزو وہ ہے جس کا انسان اپنے نفس میں اندازہ کرتا ہے اور سُوَّلَ وہ ہے جس کو وہ طلب کرتا ہے۔ گویا یہ اُمْنِيَّةِ کے بعد کا مرتبہ ہے اور اس کا اصل سُؤْلَ ہے ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى﴾ [طٰہٰ: 36:20] ''کہا اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔'' اور سُؤْلَ وہ حاجت نفس ہے جس کا پورا ہونا انسان چاہتا ہے۔ (غ)

یہاں پھر بائبل کے ذکر میں اور قرآن شریف میں ایک بین فرق نظر آتا ہے۔ بائبل میں ہے کہ جب یہ خبر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس کو باور کر لیا اور کہا:

''یوسف بے شک پھاڑا گیا تب یعقوب نے اپنے کپڑے پھاڑے اور ٹاٹ اپنے کولے پر ڈالا اور بہت دن تک اپنے بیٹے کے لیے غم کیا۔'' [پیدائش: 33:37, 34]

یہ بات شان نبوت سے بعید ہے۔ قرآن کریم نے اس کی بجائے کیسے پاک لفظ فرمائے ہیں ﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ﴾ اتنے بڑے عظیم الشان صدمے پر بھی نہ صرف صبر کیا بلکہ صبر کو جمیل فرمایا یعنی خوبی کی بات یہی ہے۔ اس میں دوسروں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ سخت سے سخت مصائب کے وقت واویلا اور جزع فزع سے بچیں اور صبر کا طریق اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر راضی

وَ جَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور ایک قافلہ آیا تو انہوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا، کہا خوشخبری ہو یہ لڑکا ہے اور اسے مال تجارت قرار دے کر چھپا رکھا، اور اللہ جانتا ہے جو یہ کرتے ہیں۔ (1526)

ہوں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا گیا تو اس صدمہ عظیم میں انہوں نے یہی فرمایا کہ میں وہی کہتی ہوں جو یعقوب نے کہا ﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ (صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب حَدِيثُ الإِفْكِ، حديث: 4141) ایک اور بڑا فرق جو قرآن شریف اور بائبل میں ہے یہ ہے کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقین تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مارے نہیں گئے بلکہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ آخر ان باتوں کو پورا کرے گا جو رؤیا میں ان کو دکھائی گئیں۔ جس طرح بائبل کے اس بیان کی بجائے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف کا رؤیا سن کر اسے ڈانٹا، قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس خواب کی تعبیر بتائی کہ یوسف کو دینی اور دنیوی عظمت ملے گی۔ اسی طرح اس پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اپنے بیٹوں کو صاف کہہ دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو یہ سب غلط ہے اور ﴿وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ﴾ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو پورا کرے گا جو اس نے دکھائی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی یہ لوگ لگا لائے تھے۔ بائبل میں ہے کہ یہ ایک ''بوقلمون قبا'' تھی جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو بنوا کر دی تھی۔ لیکن جیسی بھی ہو ان کی غرض تو اپنی بات کی تائید تھی کہ بھیڑیا یوسف کو کھا گیا اور اس کی قمیص باقی رہ گئی اور اس پر خون کے نشان بھی ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں تین مرتبہ قمیص کا ذکر آتا ہے۔ جس قمیص کو یوسف کے بھائیوں نے بطور شہادت پیش کیا۔ اسی سے حضرت یعقوب علیہ السلام معلوم کرتے ہیں کہ جھوٹ موٹ کے نشان ہیں۔ گویا یوسف کے زندہ ہونے کی وہ شہادت بنی۔ دوسرے موقعہ پر ایک قمیص سے ہی یوسف کی بریت کی شہادت ملی اور تیسرے موقعہ پر اپنی قمیص کو ہی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ کے پاس بھیجا۔ گویا وہ یوسف کی شان وشوکت کی شہادت بنی۔ بالفاظ دیگر یوسف علیہ السلام کی زندگی، یوسف علیہ السلام کی عصمت اور یوسف علیہ السلام کی شان وشوکت کی گواہی قمیص سے ہی ملتی ہے اور رؤیا میں **قمیص کی تعبیر علم ہے** جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر پر میں نے لمبی قمیص دیکھی اور اس کی تعبیر علم کی اور یہاں اس سورت میں بھی جس طرح قمیص کا ذکر تین دفعہ آتا ہے تین ہی دفعہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تاویل احادیث کے علم کا ذکر بالخصوص آتا ہے یعنی آیت 6 میں اور 21 میں اور 101 میں۔

1526 - بِضَاعَةً۔ مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے رکھا جائے ﴿هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا﴾ [65] اور اس کا اصل بَضَعَ ہے جس کے معنی ہیں گوشت کا ٹکڑا جو کاٹا جائے اور حدیث میں ہے: [فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّي] (صحيح البخاری، كتاب فضائل الصحابة، باب مَنَاقِبُ قَرَابَةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَمَنْقَبَةِ فَاطِمَةَ، حديث: 3714) یعنی فاطمہ گویا میرے جسم کا ٹکڑا ہے اور بِضع

وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع 2 14 12

اور اسے تھوڑی سی قیمت چند درہموں پر بیچ ڈالا اور وہ اس کے بارے میں بے رغبت تھے۔(1527)

وَ قَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ٞ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور جس نے اسے مصر میں خریدا تھا اس نے اپنی عورت سے کہا، اسے عزت کی جگہ دے شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں جگہ دی تا کہ ہم اسے باتوں کی حقیقت سکھائیں۔ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔(1528)

وہ ہے جو دس سے کاٹا جائے یعنی تین سے 9 تک پر بولا جاتا ہے۔(غ)

1527 - زَاهِدِیْنَ۔ زَهِیْدٌ بہت تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں اور [اَلزَّاهِدُ فِی الشَّیْءِ] کے معنی ہیں اس کی طرف سے بے رغبتی دکھانے والا۔ گویا اس کی طرف سے نہایت تھوڑی چیز پر راضی ہوجاتا ہے۔(غ) یہی معنی یہاں ہیں اور زُهْد دین سے خاص ہے جو دنیا کی رغبت اور حرص کی ضد ہے۔(ل) بائبل میں ہے کہ پہلے یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو مدیانیوں (قافلہ والوں) کے ہاتھ بیچا پھر مدیانیوں نے اسے مصر میں جا بیچا۔ قرآن شریف سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والے اسے چھپا کر لے گئے اور مصر میں جا بیچا اور ان لوگوں کو اس کے بارہ میں کچھ زیادہ رغبت نہ تھی۔

1528 - ﴿مَکَّنَّا﴾۔ تَمْکِیْنٌ کے معنی ہیں مضبوطی اور قوت دینا اور اسباب تصرف دینا [دیکھو نمبر: 906]۔ مگر مَکَانَۃٌ منزلہ اور مرتبہ کو کہتے ہیں۔(ت) علاوہ ازیں اسباب تصرف دینے سے مراد بھی معزز بنانا ہی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ خریداری وہ نہیں جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب پچھلی آیت میں فروخت کنندہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی سمجھے جائیں۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک معزز عہدیدار کے ہاں مقام عزت ملتا ہے اور یہ ان کے استحکام اور علم کی زیادتی کا موجب بن جاتا ہے۔ اللہ کا اپنے امر پر غالب آنا یہ ہے کہ وہ جس طرح پر چاہے ہوتا ہے، کوئی اس کے امر کو روک نہیں سکتا اور یہ اشارہ ہے یوسف علیہ السلام کو مقام عزت ملنے کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حالت غلامی میں بھی عزت کے مقام پر رکھا۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب وہ اپنی بلوغت کو پہنچا ہم نے اسے حکم اور علم دیا اور اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔ (1529)

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور جس کے گھر میں تھا اس نے اسے اپنے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور دروازے بند کر لیے اور کہا ادھر آ ؤ۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ (مانگتا ہوں) میرے رب نے میرے مقام کو بہت اچھا بنایا۔ ظالم کامیاب نہیں ہوتے۔ (1530)

1529 - **بلوغ سے مراد:** اَشُدَّ جسمانی مضبوطی اور روحانی مضبوطی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ مگر چونکہ سترہ سال کی عمر کے حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت تھے جب کنعان سے نکلے اس لیے جسمانی مضبوطی وہ اسی وقت حاصل کر چکے تھے اور یہاں جس اَشُدَّ کا ذکر ہے وہ روحانی مضبوطی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اب انہیں حکم اور علم عطا ہوتا ہے اور یہ دونوں باتیں روحانی بلوغ سے تعلق رکھتی ہیں اور آگے ذکر بھی ہے کہ اسی طرح احسان کرنے والوں کو ہم بدلہ دیتے ہیں۔ حکم سے مراد یہاں بعض نے نبوت کو لیا ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ اس وقت تک انہیں تبلیغ کا ہی کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔

1530 - ﴿رَاوَدَتْهُ﴾۔ رَوْدَ کے معنی ہیں کسی چیز کی طلب میں نرمی سے تردد کرنا اور اِرَادَۃٌ اصل میں وہ قوت ہے جو شہوت اور حاجت اور امل سے مرکب ہو یعنی جس میں خواہش اور حاجت اور امید یا آرزو پائی جائے اور ارادہ کی ابتدا نفس کا کسی چیز کی طرف کھینچنا ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ حکم لگایا جائے کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق ارادہ کا لفظ بولا جائے تو مراد اس کی منتہا ہوتا ہے یعنی ایک بات میں حکم لگانا جیسے ﴿اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً﴾ [الأحزاب: 17:33] ''اگر وہ تمہیں تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے یا (تمہیں تکلیف پہنچا سکے اگر) وہ تم پر رحم کرنے کا ارادہ کرے۔'' یا ﴿اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ﴾ [الرعد: 11:13] ''اور جب اللہ کسی قوم کے لیے تکلیف کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کسی طرح ردّ نہیں ہو سکتی۔'' اور انسان میں ارادۃ عموماً نفس کا کسی چیز کی طرف کھچنا ہے اور کبھی اس سے مراد قصد یا طلب کرنا ہوتا ہے جیسے ﴿لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ﴾ [القصص: 83:28] ''زمین میں بڑائی نہیں چاہتے۔'' اور ارادۃ جس طرح قوت اختیاری سے ہوتا ہے کبھی قوت تسخیری اور حسی سے ہوتا ہے یعنی بے جان چیزوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے ﴿جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ﴾ [الکھف: 77:18] ''دیوار جو گرا چاہتی تھی۔'' اور حیوانات پر بھی بولا جاتا ہے اور مُرَاوِدَۃٌ (جس سے فعل ماضی آیا ہے) یہ ہے کہ تم اپنے غیر سے ارادہ میں جھگڑا کرو اور جو وہ ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف ارادہ کرو یا جس چیز کو وہ طلب کرتا ہے اس کے خلاف طلب کرو اور [وَرَاوَدَتْهُ عَنْ نَّفْسِهٖ] کے معنی ہیں [تُصَرِّفُهُ عَنْ رَّأْیِهٖ] یعنی اس کو اپنی رائے سے یا ارادہ سے پھیرنا چاہا۔ (غ)

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور اس عورت نے اس کا قصد کیا اور وہ بھی اس کا قصد کرتا اگر وہ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا۔ یوں ہوا تا کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو پھیر دیں وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا۔ (1531)

﴿غَلَّقَتِ﴾۔ غَلَّقَ کے معنی بند کرنا اور اِغْلَاقٌ یا تَغْلِیْقٌ (جس سے یہاں فعل ہے) کثرت سے بند کرنا یعنی بہت دروازوں کا بند کرنا یا بار بار بند کرنا۔ (غ)

هَیْتَ اور هَلُمَّ کے معنی قریب قریب ہیں یعنی آ ؤ۔ (غ) ﴿هَیْتَ لَكَ﴾ اَقْبِلْ یعنی آ گے آ ؤ۔ (ل) بعض نے اسے عبرانی سریانی وغیرہ کہا ہے مگر مجاہد کہتے ہیں کہ یہ عربی ہے۔ (ر)

عصمت یوسفؑ:

قرآن کریم نے جو لفظ اختیار کیے ہیں ان سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادہ عصمت کی مضبوطی پر کافی شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ رَاوَدَتْ میں یہ بتایا ہے کہ اس عورت کا ارادہ یوسف کے ارادہ کے خلاف تھا اور ﴿عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ میں اور بھی اس کو موکد کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس عورت کی تمام کارروائیوں اور ارادوں کا ایک ہی جواب دیا ہے معاذ اللہ۔ معلوم ہوا کہ آپ کے ارادہ عصمت میں ادنیٰ جنبش بھی نہیں آئی۔ ﴿اِنَّهٗ رَبِّیْٓ﴾ سے مراد بعض نے اس عورت کا خاوند لیا ہے مگر ایک متقی آدمی کے منہ سے رَبِّیْ سے مراد اللہ تعالیٰ ہی لینا بہتر ہے۔ اور اچھی جگہ دینا بھی حضرت یوسف علیہ السلام عزیز کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ محض ایک واسطہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو حقیقی سبب ہے۔ کیونکہ عزیز کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ہی یوسف کی عزت کی طرف پھیرا۔ کس قدر کامل ایمان ہے کہ فرماتے ہیں اگر میں ایسا کام کروں تو یہ ظلم ہے اور ظالم کامیاب نہیں ہوتا۔ ایسے موقعہ پر جہاں تنہائی ہو، ایک عورت جو مالکہ ہے اپنے غلام کو اپنی طرف بلائے، دروازے بند ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا عصمت کے بلند مقام پر کھڑا ہونا اس ذکر کے پڑھنے والوں کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا روحانی سبق ہے اور حقیقت میں اگر عزیز مصر کی عورت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مقام عصمت سے پھیرنے کی کوشش کی تو قریش مکہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کو وہ امین جانتے اور کہتے تھے، مقام عصمت سے ہٹانے کے لیے خوبصورت سے خوبصورت عورت دینے کا لالچ دیا۔ جس کا جواب آپ نے یہ دیا کہ دنیا کی حکومت اور دولت اور خوبصورتی کیا حقیقت رکھتی ہیں اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیں تو بھی میں اپنے مقام کو نہ چھوڑوں گا۔

1531 - ﴿وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ لسان العرب میں ابوعبیدہ کا قول منقول ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ [لَوْ لَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّه لَهمَّ بِهَا] اگر یوسف علیہ السلام اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا تو اس کا قصد کرتا۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے اس کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے پر پایا۔ بولی اس کی کیا سزا ہے جو تیری عورت سے برا ارادہ کرے سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا دردناک سزا ہو۔

یوسفؑ کے دل میں بدی کا خیال بھی نہیں گزرا:

بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام معصیت کا خیال دل میں لائے تھے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی کچھ ایسے اقوال منقول ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی پہلی آیت اس کے خلاف ہے اور جو کچھ وہاں فرمایا ہے اسی کی مزید تشریح یہاں ہے۔ وہاں مُرَاوَدَةٌ کا ذکر تھا یعنی اس عورت کا یوسف کو اپنے ارادہ اور اپنی رائے سے پھیرنے کی کوشش کرنا۔ اسی کوشش کا ذکر ﴿وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ﴾ میں ہے مگر اس مُرَاوَدَةٌ یا اس عورت کی کوشش کا نتیجہ وہاں بتایا تھا ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾[23] یہاں فرمایا ﴿وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں کوئی خیال معصیت کا آتا تو قرآن کریم آپ کی طرف الفاظ ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ منسوب نہ کرتا۔ اور پھر دوسری جگہ خود اس عورت کی شہادت حضرت یوسف کی عصمت پر موجود ہے ﴿وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ﴾[32] میں نے اس کو اس کے ارادہ سے پھیرنا چاہا مگر وہ مضبوط رہا اور عصمت اختیار کی۔ یہاں صرف مُرَاوَدَةٌ اور اس کے محفوظ رہنے کا ذکر ہے۔ اگر کوئی اور واقعہ بھی ہوا ہوتا جیسا کہ ان مفسرین نے خیال کر لیا ہے جنہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ [جَلَسَ مِنْهَا مَجْلِسَ الرَّجُلَ مِنْ اِمْرَاْتِهٖ] تو وہ عورت یوسف علیہ السلام کے معصوم ہونے کی شہادت نہ دیتی۔ جہاں کہیں اس واقعہ کا ذکر ہے دو ہی باتوں کا بیان ہے۔ عورت کی کوشش اور یوسف کا بچا رہنا۔ جب دوسری عورتوں نے یوں شہادت دی ﴿مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ﴾[51] تو اس عورت نے بھی یہی کہا ﴿اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾[51] نہ دوسری عورتیں یوسف میں کسی ادنیٰ بدی کے خیال کی شہادت دیتی ہیں نہ عزیز کی عورت۔ وہی صدق جو پہلے قرائن سے ظاہر ہو چکا اب خود عزیز کی عورت اس کا کھلا اعتراف کرتی ہے۔ غرض یہ خیال کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس عورت سے ارادۂ بد کیا تھا بالکل باطل اور قرآن کریم کے مخالف ہے۔ [حَلْ سَرَاوِيْلَ] تک نوبت پہنچنے سے پہلے بہت سے مبادی ہوتے ہیں جو انسان ان میں مبتلا ہو جائے وہ معصوم نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی جب وہ اپنی بریت کا اظہار کرے تو اسے صادق کہا جا سکتا ہے اور خود اس آیت میں ہے ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ﴾[24] جہاں ظاہر ہے کہ فحشاء بے حیائی کے فعل کا ارتکاب ہے خواہ وہ زنا ہو یا مبادی زنا اور سُوْءً بے حیائی کا خیال دل میں لانا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ حضرت

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۲۶

(یوسف نے) کہا اس نے مجھے میرے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور اس کے لوگوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ (1532)

یوسف علیہ السلام سے نہ صرف زنا اور ہر قسم کے مبادی زنا کی نفی کرتا ہے بلکہ ان گندے خیالات کے آپ کے پاک دل میں آنے کی بھی نفی کرتا ہے۔ اور ﴿هَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ کی جس طرح ترکیب ہے ایسے ہی دوسری جگہ ہے ﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْ لَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ [القصص: 10:28] یعنی حضرت موسیٰ کی والدہ اس بات کو ظاہر کر دیتی اگر ہم نے اس کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ جواب کا شرط پر مقدم ہونا ممتنع نہیں تاہم اس کی ترکیب ایسی ہے جیسے عرب کہتے ہیں [اَنْتَ ظَالِمٌ اِنْ فَعَلْتَ كَذَا] جہاں ظلم کا اثبات نہیں بلکہ نفی ہے۔ اسی طرح یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے هَمَّ کی نفی ہے اور تفسیر بحر المحیط میں ہے کہ بعض لوگوں نے یوسف کی طرف وہ بات منسوب کی ہے جو ایک فاسق کی طرف بھی منسوب نہیں کی جا سکتی حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام سے هَمَّ کے واقع ہونے کا نہیں بلکہ اس کی نفی کا ذکر ہے۔

﴿بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ کو کسی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا بطور تمثل نظر آنا اور نصیحت کرنا کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس عورت نے اپنے بت پر پردہ ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اگر تجھے اس پتھر سے شرم آتی ہے جو نہ سنتا ہے، نہ عقل رکھتا ہے تو میں اپنے خدا سے شرم نہ کروں جو ہر وقت اور ہر حال میں دیکھتا ہے۔ اور بعض نے کہا کوئی تحریر سامنے آ گئی یا جبریل علیہ السلام نے آ کر روک دیا۔ مگر قرآن شریف نے خود اس دلیل کا ذکر پہلی آیت میں کیا ہے ﴿اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۳﴾ اور یہی وہ برہان رب تھی جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بچا لیا یعنی ان کا کامل ایمان اللہ تعالیٰ پر اور اس کی ربوبیت پر اور اس بات پر کہ ظالم کو فلاح نہیں ملتی۔

1532 - **یہ شاہد کون تھا:** یہ شاھد بعض کے نزدیک ایک چھوٹا بچہ تھا اور بعض کے نزدیک دانا عمر رسیدہ آدمی۔ دونوں قسم کے اقوال ابن کثیر میں اور ابن جریر میں موجود ہیں۔ اس کی گواہی اس قدر تھی کہ اس نے ایک مضبوط قرینہ کی طرف توجہ دلائی۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **قرائن کی شہادت** بھی مقدمات کے فیصلہ کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے حضرت یوسف علیہ السلام کی بریت یہاں بھی کی ہے اور آگے چل کر بھی، مگر بائبل میں صرف اسی قدر ذکر کر کے کہ جب عزیز کی عورت نے اسے بلایا تو ''وہ اپنا پیراہن چھوڑ کر بھاگا۔'' [پیدائش: 13:29]

بریت کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اسی جرم کی بنا پر اسے قید کیا جاتا ہے اور پیراہن چھوڑ کر بھاگنے کا واقعہ اس جرم میں تائیدی شہادت بن جاتا ہے اور اس الزام سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قطعاً کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ یہ کتاب کیونکر اخلاق فاضلہ سکھا سکتی ہے جس

وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ جھوٹی ہے اور وہ سچوں میں سے ہے۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

سو جب اس نے اس کی قمیص کو پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو کہا یہ تم عورتوں کی چال ہے بلاشبہ تمہاری چال بڑی بھاری ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۫ وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ ع 3 9 13

یوسف! اس سے درگزر کر اور (اے عورت) اپنے قصور کی معافی مانگ کیونکہ تو خطا کاروں میں سے ہے۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

اور شہر میں عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو اس کے ارادہ سے پھیرنا چاہتی ہے۔ اس کی محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے ہم اسے صریح غلطی میں پاتی ہیں۔ (1533)

میں ایک پاک انسان پر تہمت کا ذکر کر کے اسے اس تہمت سے بری نہیں کیا جاتا اور اس سے پہلے باب میں اسی کتاب پیدائش میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ایک بھائی یہوداہ کے متعلق ایک نہایت گندے اور فحش قصے کا ذکر کیا ہے جو اگر کسی ناول میں بھی ہوتا تو اسے پڑھنے کے ناقابل قرار دیا جاتا۔ مگر بائبل باوجود ان گندے قصوں کے کتاب مقدس کہلاتی ہے اور قرآن کریم کو باوجود اس کے اعلیٰ اخلاقی تعلیم کے ردّ کیا جاتا ہے۔

1533 - مَدِيْنَةٍ۔ [مَدَنَ بِالْمَكَانِ] کے معنی ہیں مکان میں ٹھہرا۔ اور اسی سے مَدِيْنَةٌ اس قلعہ کو بھی کہتے ہیں جو کسی زمین کے وسط میں بنایا جائے اور اس زمین کو بھی جس میں ایسا قلعہ بنایا جائے اور بالخصوص یہ لفظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر پر بولا جاتا ہے اور جب اس کی طرف کسی چیز کو منسوب کیا جائے تو مَدَنِيٌّ کہا جاتا ہے اور عام معنی میں مَدِيْنَةٌ کی طرف منسوب ہو تو مَدِيْنِيٌّ۔

﴿الْعَزِيْزِ﴾۔ عَزِيْزٌ۔ غَالِبٌ کو کہتے ہیں اور بادشاہ کو اور مصر کے بادشاہوں کا یہ خطاب تھا (ت) مگر یہاں بادشاہ مراد نہیں۔ اس لیے کہ اس کا ذکر لفظ ملک میں الگ آتا ہے۔ بلکہ اس کے عظیم الشان امرا میں سے ایک مراد ہے جس کے سپرد کل کاروبار سلطنت کا انصرام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب یہی حیثیت حضرت یوسف علیہ السلام کو ملتی ہے تو پھر اسے اسی خطاب العزیز سے

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

جب اس نے ان کی چال سنی ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لیے کھانا تیار کیا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک (ایک) چھری دی اور (یوسف کو) کہا ان کے سامنے نکل۔ سو جب انہوں نے اسے دیکھا، اسے بہت بڑا سمجھا اور اپنے ہاتھ کاٹے اور بول اٹھیں اللہ پاک ہے اور یہ انسان نہیں یہ تو ایک بزرگ فرشتہ ہے۔ (1534)

پکارا جاتا ہے۔ بائبل میں اس کا نام فوطیفار لکھا ہے جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا۔

شَغَفَ۔ شَغَافَ۔ [غِلَافُ الْقَلْبِ] یا دل کے پردے کا نام ہے اور ﴿شَغَفَهَا حُبًّا﴾ کے معنی ہیں کہ اس کی محبت اس کے دل کے پردے کے نیچے داخل ہوگئی یا اس کے دل پر غالب آ گئی۔ (ل)

1534 - ﴿بِمَكْرِهِنَّ﴾۔ مَكْرٌ باریک تدبیر کو کہتے ہیں۔ عورتوں کی گفتگو کو جو انہوں نے عزیز کی عورت کے متعلق کی مکر اس لیے کہا کہ انہوں نے اسے یوسف کے دیکھنے کا حیلہ بنایا اور یا ان کی غیبت اور بری باتوں کے ذکر کو مکر اس لیے کہا کہ اخفا میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ مکر سے مراد یہ ہو کہ انہوں نے کہلا بھیجا ہو کہ ہم ایک تجویز کرتے ہیں جس سے یوسف کو قابو میں لایا جاسکتا ہے اور اسی غرض کے لیے انہیں بلایا گیا ہو۔ اس صورت میں پچھلی آیت کے آخر پر ﴿ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ یا صریح غلطی سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس نے ٹھیک طریق اس غرض کے حصول کا اختیار نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ اسے چاہیے تھا کہ پہلے یوسف کو کسی اور کی معرفت اس بات پر راضی کر لیتی۔

﴿مُتَّكَاً﴾۔ تَوَكَّا اور اِتَّكَا (مادہ وَكَّا ہے) کے معنی ہیں ٹیک لگائی ﴿هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا﴾ [طٰہٰ: 18:20] ''یہ میرا عصا ہے میں اس پر سہارا لگاتا ہوں۔'' ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ﴾ [یٰسٓ: 56:36] ''تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔'' اور مُتَّكَاً تکیہ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں اور طعام یا کھانے کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کھانے کے لیے ٹیک لگائی جاتی تھی اور اس امت کو ٹیک لگا کر کھانے سے منع کیا گیا ہے اور بعض نے مُتَّكَاً کے معنی مجلس بھی کیے ہیں۔ (ل) اور ترنج بھی اس کے معنی ہیں۔ (غ) اور ان سب کے مطابق ابن جریر میں روایات بھی موجود ہیں۔

سِكِّيْنٌ۔ سَكَنَ سے ہے چھری کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اس چیز کو جسے اس سے ذبح کیا جائے حالت سکون میں کر دیتی ہے۔ (ل)

﴿اَكْبَرْنَ﴾۔ [اَكْبَرْتُ الشَّيْءَ] کے معنی ہیں [رَاَيْتُهُ كَبِيْرًا] اسے بڑا دیکھا۔ (غ)

﴿حَاشَ لِلّٰهِ﴾ کے معنی [بُعْدًا مِّنْهُ] اور تنزیہ کے طور پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ (غ) یعنی ہر ایک عیب اللہ سے دور ہے۔

عورتوں کا یوسف کو یکا یک دیکھ کر جب وہ کھانے میں مصروف تھیں اور اس غرض کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں حیرت

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

(عزیز کی عورت نے) کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں اور میں نے اسے اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا مگر یہ بچا رہا اور اگر جو میں حکم دوں اس نے نہ کیا تو اسے ضرور قید کر دیا جائے گا اور وہ ذلیل لوگوں میں سے ہوگا۔ (1535)

زدہ ہوجانا اور **اپنے ہاتھوں کو کاٹ لینا** کوئی ایسا تعجب انگیز واقعہ نہیں جس کا انکار کیا جائے۔ ہاں ہاتھوں کے کاٹنے سے مراد یہاں یہ نہیں کہ ہاتھ کٹ کر الگ ہو گئے تھے بلکہ چھری سے ان پر زخم ہوجانا مراد ہے اور گو یہ مجاز ہے مگر مفسرین نے بھی عموماً اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ یہاں تک کہ عکرمہ سے ایک معنی مروی ہیں کہ ہاتھوں کو نہیں بلکہ آستینوں کو کاٹ لیا تھا۔ اور مجاز کے رنگ میں ہی یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حیرت سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔ جیسا غضب کے وقت انگلیوں کے کاٹنے کا محاورہ ہے ﴿عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ [آل عمران: 119:3] ''سخت غصے کے بارے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔'' اور ان کا یہ کہنا کہ یہ بشر نہیں بلکہ فرشتہ ہے صرف حسن صورت کے لحاظ سے نہیں بلکہ عصمت پر مضبوطی کے لحاظ سے یہ لفظ زیادہ موزوں ہیں اور قرین قیاس ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس حسن و زینت کے مجمع کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جس پر انہیں اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ ایک دوسری توجیہ ان الفاظ کی وہ بھی ہو سکتی ہے جس کی طرف لفظ مکر کی تشریح میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی **عزیز کی عورت نے ان کو ایک چال کرنے کے لیے بلایا تھا** اور وہ تجویز انہوں نے اسے پہلے بتا دی ہوگی۔ اس لیے دعوت کا سامان تیار کر کے چھریاں وغیرہ ان کے ہاتھ میں دے دیں اور یوسف کے نکلنے پر ان سب نے یا بعض نے چھریوں کو عمداً ہاتھوں پر لگا لیا اور پھر یوسف پر زور ڈالا کہ یہ واقعہ تمہارے خلاف بطور شہادت ہو جائے گا ورنہ تم عزیز کی عورت کی بات مان لو۔ اور پھر بھی جب حضرت یوسف علیہ السلام نے انکار ہی کیا تو وہ بول اٹھیں کہ یہ بشر نہیں جو کسی بات کی پروا بھی نہیں کرتا بلکہ فرشتہ ہے۔ اس صورت میں اگلی آیت میں ﴿لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ﴾ سے مراد ہوگی کہ تم مجھے ملامت کرتی تھی کہ میں اسے راضی نہیں کر سکی اب تم نے بھی زور لگا کر دیکھ لیا۔ مزید تشریح کے لیے [دیکھو نمبر: 1536]

ان واقعات کا ذکر بھی بائبل میں نہیں۔ مگر جس مقام عصمت کو حضرت یوسف علیہ السلام کے بیان میں ظاہر کرنا مقصود ہے اس کی اصل غرض حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ یہ نہ دکھایا جائے کہ ایک ہی عورت نہیں بلکہ کل شہر کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں کی حسین عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے مقام عصمت سے ایک بال برابر ادھر ادھر نہیں کر سکیں۔ اسی بلند مقام پر ہر مسلم کو پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سبق بائبل کے قصہ سے نہیں ملتا۔

1535 - اسْتَعْصَمَ۔ یعنی اس چیز کو طلب کیا جو اسے بچائے رکھے۔ (غ) یا حالت عصمت میں رکھے۔

عزیز کی عورت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان سب کے سامنے دھمکی دی کہ اگر وہ اس کی ناجائز خواہش کو پورا نہ کرے گا تو ذلیل کر دیا

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

(یوسف نے) کہا اے میرے رب! مجھے قید اس سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اور اگر تو ان کی چال کو مجھ سے نہ پھیر دے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ (1536)

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

سو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان کی چال کو اس سے پھیر دیا وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

جائے گا اور قید کر دیا جائے گا اور یہ کہہ کر اس کے بارہ میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں ان کی ہمدردی کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔

1536 - اَصْبُ۔ صَبَاءَ کے معنی ہیں [نَزَعَ وَاِشْتَاقَ وَفِعْلَ فِعْلَ الصِّبْيَانِ] یعنی ایک چیز کی طرف کھچا چلا گیا اور مشتاق ہوا اور لڑکوں کا سا کام کیا کیونکہ صَبِیّ لڑکے کو کہا جاتا ہے۔

عورتوں کا یوسفؑ پر دباؤ ڈالنا:

یہاں ان عورتوں کے سارے مشوروں کا ذکر نہیں جو اس وقت انہوں نے کیے یا جو کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا مگر ﴿مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ﴾ اور ﴿كَیْدَهُنَّ﴾ سے صاف ظاہر ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو کسی بات کے لیے کہا ہے اور کوئی چال چلی ہے جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کو سخت فکر ہوا اب بلانے والی ایک نہیں اور نہ چال چلنے والی اکیلی عزیز کی عورت ہے بلکہ یہ عورتیں بھی اس چال میں شامل ہو گئیں ہیں اور وہ بھی کسی رنگ میں حضرت یوسفؑ کو اسی بات کی طرف بلاتی ہیں جس کی طرف عزیز کی عورت نے بلایا تھا۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ عورتیں عزیز کی عورت کے منشا کو پورا کرنے میں معاون ہو گئیں اور انہوں نے اپنے ہاتھوں کے کاٹنے کو اس بات کی طرف منسوب کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ان کی عفت پر حملہ کیا ہے اور ان کے ہاتھوں وغیرہ پر اس وجہ سے زخم آ گئے ہیں۔ اس لیے باوجود اس بات کے کہ عزیز اپنی بیوی کے معاملہ میں مطمئن ہو چکا تھا کہ قصور عورت کا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب قید خانہ سے رہائی کا حکم جاتا ہے تو وہ اپنی بریت سے پیشتر اس سے نکلنا پسند نہیں کرتے اور اس بریت کے لیے عزیز کی عورت کی طرف سے بریت نہیں چاہتے بلکہ یوں کہتے ہیں ﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴿۵۰﴾﴾ [50] ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے۔ میرا رب ان کی چال سے خوب واقف ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ہاتھ کاٹنے کا واقعہ یا تو فی الواقع کوئی چال تھی یا اسے بطور ایک چال کے استعمال کیا گیا۔ اور ان عورتوں کا جواب ﴿مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ [51] ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں پائی، یوسف کی بریت کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ ع 4 6 14

پھر اس کے بعد کہ نشانیاں دیکھ چکے تھے، انہیں یہ سوجھا کہ اسے ایک وقت تک قید کر دیں۔ (1537)

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے اپنے آپ کو شراب نچوڑتے ہوئے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جن میں سے پرند کھا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتا۔ کیونکہ ہم تجھے نیکوکاروں میں سے دیکھتے ہیں۔ (1538)

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ

اس نے کہا جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے تمہارے پاس آنا نہیں پائے گا کہ میں اس کی تعبیر تمہیں بتا دوں گا۔ قبل اس کے کہ وہ (کھانا) تمہارے پاس آئے یہ وہ علم ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا کیونکہ میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے

سے کسی برائی کا الزام پہلے دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کی یہ صراحت صاف بتاتی ہے کہ اس موقعہ پر ان عورتوں نے یا تو عمداً ہاتھ کاٹے تھے اور یا اگر استعجاب میں ہاتھ کٹ گئے تھے تو اسی واقعہ کو یوسف کے خلاف ایک نئے الزام کی صورت میں کھڑا کیا گیا۔

معصیت پر قید کو ترجیح:

اور اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کو بتایا گیا کہ عزیز کی عورت کی خواہش کو پورا کر دو، ورنہ جیل خانہ میں جانا ہوگا۔ اسی پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ﴾ یعنی قید خانہ کو اختیار کرنا آسان ہے اور معصیت میں پڑنا مشکل ہے۔ اسی ایمان پر اللہ تعالیٰ ہر مسلم کو قائم کرنا چاہتا ہے کہ معصیت اسے قید سے اور ہلاکت سے بڑی مصیبت معلوم ہو۔

1537 - آیات یا نشانوں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی بریت کے نشان ہیں۔ باوجود اس کے کہ قرائن کی شہادت سب حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں تھی مگر چونکہ معاملہ قومی تھا اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کر دیا۔

1538 - دونوں قیدی جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس رہ کر نیکی کو دیکھتے ہیں تو اپنی خوابیں آپ کے پاس بیان کرتے ہیں۔

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ (1539)

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور میں اپنے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کا پیرو ہوں، ہمارا کام نہیں کہ کسی چیز کو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائیں۔ یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (1540)

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ خداوند اچھے ہیں یا اللہ (جو) اکیلا سب پر غالب (ہے)۔ (1541)

1539 - چونکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے دیکھتے ہیں اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اول ان کو نصیحت شروع کی کہ شاید وہ بھی اصلاح کی راہ پر آ جائیں۔ **بائبل** میں یہ حصہ پھر مفقود ہے اور صرف خوابوں اور خوابوں کی تعبیر کا ذکر ہے۔ ایک ایک قدم پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ **قرآن کریم** نے کس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر کو مفید نصائح سے بھر دیا ہے۔ حالانکہ بائبل میں یہ ایک خشک کہانی ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ زندان کے پتھر کی دیواریں بھی انسان کو نیکی سے نہیں روک سکتیں جو اس کی زندگی کی اصل غرض ہے۔ اور یہ جو شروع میں کھانے کا ذکر کیا ہے تو مراد یہ نہیں کہ کھانے کی کیفیت بتا دوں گا بلکہ تَاْوِیْلِہٖ سے مراد خواب کی تعبیر ہی ہے جو انہوں نے دریافت کی ہے۔ مگر چونکہ آپ ان کو کچھ وعظ کرنا چاہتے تھے اور دنیادار وعظ سے جلد اکتا جاتے ہیں اس لیے فرمایا کہ تمہارا بڑا کام تو اب کھانے سے پیٹ بھرنا ہے۔ سو اس سے پہلے پہلے میں تمہیں تعبیر بھی بتا دوں گا اور نصیحت کو بھی ختم کر دوں گا۔

1540 - یہاں صرف اصل اصول مذہب کا ذکر ہے یعنی توحید باری جو سب مذاہب میں یکساں ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ جو اصول ان کے مذہب کے ہیں وہی میرے مذہب کے اصول ہیں۔

1541 - گویا شرک کرنے والا مختلف آقاؤں کی غلامی اختیار کرتا ہے اور مختلف آقاؤں کا غلام کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا۔ اللہ سب پر غالب ہے۔ پس جو اس کی غلامی اختیار کرتا ہے اس کو اور کسی کی احتیاج نہیں رہتی۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اسے چھوڑ کر تم صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہ سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔[1542]

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا صلیب دیا جائے گا تو پرند اس کے سر سے (نوچ کر) کھائیں گے۔ اس بات کا فیصلہ ہو چکا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔

وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع 5 7 15

اور اسے جس کے متعلق اسے خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں رہائی پائے گا کہا میرا ذکر اپنے آقا کے پاس کرنا، مگر شیطان نے اسے اپنے آقا کے پاس ذکر کرنا بھلا دیا سو (یوسف) کئی سال قید خانہ میں پڑا رہا۔[1543]

1542 - اَسْمَآءً سے مراد یہاں صرف الفاظ ہیں جن کے نیچے حقیقت کوئی نہیں۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ میں بتایا ہے کہ وہی حکم درست ہے جو اللہ دے اور اللہ نے آج تک اپنے کسی نبی کے ذریعہ سے یہ حکم نہیں دیا کہ خدا تعالیٰ کے سوائے اوروں کی بھی پرستش کرو۔ بلکہ وہ ہمیشہ ہی حکم دیتا رہا ہے کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔

1543 - ﴿ذِكْرَ رَبِّهٖ﴾ میں اضافت ادنیٰ ملابست ہے اور مراد ہے [ذِكْرَ يُوْسُفَ عِنْدَ رَبِّهٖ] یہ درخواست استعانت غیر اللہ میں داخل نہیں بلکہ چونکہ انہوں نے آپ کی نیکی کو دیکھ کر خود اعتراف کیا تھا اس لیے آپ نے یہی چاہا کہ یہی شہادت حقہ وہ بادشاہ کے دربار میں بھی ادا کر دے تا اسے معلوم ہو جائے کہ یوسف پر ناحق الزام لگایا گیا ہے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳

اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے سات موٹی گائیں دیکھی ہیں۔ انہیں سات دبلی (گائیں) کھاگئی ہیں۔اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی۔اے درباریو! میرے خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر کر سکتے ہو؟(1544)

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ۝۴۴

انہوں نے کہا پریشان خواب ہیں۔اور ہمیں (ایسے) خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں۔(1545)

1544 - ﴿سِمَانٍ﴾۔ سَمِیْنٌ کی جمع ہے اور سَمَنٌ ھَذَالٌ کی ضد ہے یعنی فربہی اور لاغری۔اور اَسْمَنَ کے معنی اسے موٹا کیا ﴿لَّا یُسْمِنُ وَ لَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍؕ﴾ [الغاشیة: 7:88] ''وہ نہ موٹا کرتا ہے اور نہ بھوک میں کام آتا ہے۔'' اور سَمْنٌ گھی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ موٹا کرتا ہے۔(غ)

﴿عِجَافٌ﴾۔ اَعْجَفُ اور عَجْفَاءُ کی جمع ہے جو ہزال سے بہت پتلا ہو گیا ہو۔

﴿خُضْرٍ﴾۔ اَخْضَرَ کی جمع ہے سبز۔ یٰبِسٍ۔ یَبْسَ سے ہے جس کی رطوبت جاتی رہی ہو۔(غ)

﴿تَعْبُرُوْنَ﴾۔ عَبْرَ کے معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز۔ پھر پانی سے گزرنے سے عُبُور مخصوص ہے اور تعبیر رؤیا سے خاص ہے (اور رؤیا کے لیے تاویل کا لفظ بھی بولا جاتا ہے مگر یہ عام لفظ ہے۔ دوسری جگہ بھی بولا جاتا ہے) گویا رؤیا کے ظاہر سے باطن کی طرف گزرنا ہے۔ عِبْرَۃٌ وغیرہ کے لیے [دیکھو نمبر: 384]

1545 - ﴿اَضْغَاثُ﴾۔ ضَغْثَ کی جمع ہے اور ضَغْثَ ایک چیز کے ایک حصہ کو دوسرے سے ملا دینا ہے اور [ضِغْثَ الْحَدِیْثَ] کے معنی ہیں بات کو خلط ملط کر دیا۔ اس لیے ایسی خوابیں ہیں جو بوجہ پریشانی کے ایک دوسرے سے مل گئی ہوں ان کو اَضْغَاثٌ کہا جاتا ہے جن کی اختلاط کی وجہ سے تعبیر نہیں ہو سکتی۔(ل)

اَحْلَامٍ۔ حِلْمٌ کے معنی ہیں غضب کے ہیجان سے نفس اور طبیعت کا ضبط میں رکھنا اور اس کی جمع اَحْلَامٌ آتی ہے۔۔۔۔۔ جہاں مراد عقل ہے گو حلم کے اصل معنی عقل نہیں اور حُلَمٌ اور حُلُمٌ کی جمع ہے اَحْلَامٌ جس کے معنی خواب ہیں۔ اور حُلُمٌ بلوغت کو بھی کہتے ہیں ﴿وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ﴾ [النور: 59:24] ''اور جب تم میں سے لڑکے بلوغ کو پہنچ جائیں۔'' اور حُلَمٌ بمعنی <u>خواب اور رؤیا میں فرق</u> یہ ہے کہ ابتداً زبان عرب میں دونوں خواب پر بولے جاتے تھے مگر شارع علیہ السلام نے رؤیا

وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

اور جو ان دونوں (قیدیوں) میں سے رہا ہوا تھا اس نے کہا اور ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا میں تمہیں اس کی تعبیر بتاؤں گا مجھے بھیجو۔ (1546)

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

یوسف اے صدیق! ہمیں سات موٹی گائیوں کی تعبیر بتاؤ، جنہیں سات دبلی (گائیں) کھا گئی ہیں۔ اور سات ہری بالیں اور دوسری سوکھی۔ تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں تاکہ وہ جان لیں۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾

(یوسف نے) کہا تم حسب معمول سات سال کھیتی کرو گے تو جو کچھ کاٹو اسے اپنے خوشہ میں ہی رہنے دو، سوائے تھوڑے کے جس سے تم کھاؤ۔ (1547)

کو اچھے خواب سے اور حُلْمُ کو برے خواب سے مخصوص فرما دیا جیسا کہ فرمایا [الرُّؤْيَا مِنَ اللهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ] رؤیا اللہ کی طرف سے ہے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے اور اسی سے احتلام ہے۔ (ل) یہی فرق قرآن کریم نے بھی رکھا ہے کیونکہ بادشاہ اپنے خواب کو رؤیا کہتا ہے اور اہل دربار اسے اَحْلَامٌ قرار دیتے ہیں۔

1546 - ادَّكَرَ۔ اصل میں اِذْتَكَرَ ہے یعنی ذِكْرٌ سے باب افتعال۔ تا دال سے بدل گئی اور ذال اس میں مدغم ہو گئی۔

1547 - دَاَبًا [دیکھو نمبر: 381]۔ مفردات میں ہے کہ دَاَبَ کے معنی [اَدَامَةُ السَّيْرِ] ہیں یعنی ہمیشہ چلتے رہنا ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ﴾ [ابراهيم: 33:14] ''اور سورج اور چاند کو جو ایک قانون پر چل رہے ہیں تمہارے کام میں لگایا۔'' پس دَاَبَ سے مراد عادت مستمرہ ہے۔ (غ)

حضرت یوسف علیہ السلام تعبیر کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے جب سات موٹی گائیوں اور سات سبز خوشوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی کہ سات سال حسب معمول کھیتی کرو گے یعنی فصلیں اچھی لگیں گی تو ساتھ ہی بتا دیا کہ جتنا کھانے کی ضرورت ہو اسے نکال کر باقی کو خوشوں میں چھوڑ دو۔ اس کی غرض یہ تھی کہ تا کیڑے سے محفوظ رہے اور خراب نہ ہو جائے۔

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾

پھر اس کے بعد سات سخت (سال) آئیں گے وہ سب کچھ کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے پہلے جمع کیا ہے۔ مگر تھوڑا جو تم بچالو گے۔ (1548)

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ ع 6 7 16

پھر ان کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر مینہ برسایا جائے گا اور اس میں وہ (انگور) نچوڑیں گے۔ (1549)

1548- یہ سات دبلی گائیوں کی تعبیر ہے جو موٹی گائیوں کو کھا گئیں۔ اور سات خشک خوشوں کی اور قلیل جو محفوظ رکھا ہے وہ بیج وغیرہ کے لیے ہے۔

بخاری میں سورہ یوسف کی تفسیر میں اس موقع پر وہ حدیث لکھی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعا سے قریش پر سات سال قحط کے آئے [قَالَ: اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوسُفَ] یعنی نبی کریم ﷺ نے دعا کی کہ اے اللہ ان پر سات سال کا قحط بھیج جیسے یوسف کے وقت میں سات سال کا قحط پڑا تھا۔ مجھے ان کی شرارتوں سے بچا۔ چنانچہ اس دعا کا اثر یہ لکھا ہے کہ [فَأَصَابَتْهُمْ سَنَةٌ حَصَّتْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى أَكَلُوا الْعِظَامَ حَتَّى جَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ إِلَى السَّمَاءِ فَيَرَى بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا مِثْلَ الدُّخَانِ] (صحيح البخاری،كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ...، حديث:4693) یعنی ان پر ایسا قحط پڑا جس نے سب چیزوں کو برباد کر دیا یہاں تک کہ لوگوں نے ہڈیاں کھا کر گزارہ کیا اور ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تو اپنے اور اس کے درمیان دھواں سا دیکھتا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی قرآن شریف میں دوسری جگہ موجود ہے ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾ [الدخان: 10:44] ''سو اس دن کا انتظار کر جب آسمان کھلا دھواں لائے۔'' اس حدیث کو سورہ یوسف کی تفسیر میں لانے کا صاف منشاء یہ ہے کہ سورہ یوسف میں بھی آنحضرت ﷺ کا ہی ذکر ہے اور یہی منشا ان الفاظ کا ہے ﴿اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ﴾ جو شروع سورت میں ہیں۔

1549- عَامٌ کے معنی سال ہیں جس طرح سَنَةٌ کے معنی سال ہیں لیکن سَنَةٌ کا استعمال زیادہ تر ایسے سال پر ہے جس میں خشکی اور شدت ہو اور عام کا اس پر جس میں بارش اور ارزانی ہو۔

يُغَاثُ - [دیکھو نمبر: 1208]۔ غَوْثٌ مدد ہے اور غَيْثٌ بارش۔ اور مدد دینے پر اَغَاثَ کہا جاتا ہے اور بارش برسانے پر غَاثَ۔ (غ)

یہ محض خوشخبری کے طور پر ہے کہ قحط کے سات سال ختم ہو کر پھر بارش ہوگی اور حدیث میں ہے کہ جب سات سال قحط کے قریش

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰

اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ۔ سو جب ایلچی اس کے پاس آیا تو اس نے کہا اپنے آقا کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، میرا پروردگار ان کی چال سے خوب واقف ہے۔ (1550)

پر گزرے تو ابوسفیان آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی قوم کے لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ تب **نبی کریم ﷺ نے دعا کی اور بارش ہوئی** اسی کی طرف اشارہ کرنے کو یہاں آخر پر بارش کے سال کا ذکر کیا۔

1550 - بَالُ۔ شان یا وہ حال جس کی پروا کی جائے۔ حدیث میں [كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ] (سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب خُطْبَةِ النِّكَاحِ :1969) اہم امور یا معاملات کو کہا گیا ہے۔ اس لفظ کو اختیار کرنے میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ جس کے صاف کرنے کو حضرت یوسف علیہ السلام اہمیت دیتے تھے۔

بائبل حضرت یوسفؑ کو الزام سے پاک نہیں کرتی:

بائبل میں یہ ذکر بھی موجود نہیں۔ بلکہ صرف اس قدر ہے کہ جب فرعون نے یوسف کو خواب کی تعبیر کے لیے بلوایا تو حضرت یوسف علیہ السلام فوراً حاضر ہوئے اور بادشاہی دربار میں آ گئے۔ برخلاف اس کے قرآن شریف اس حصہ کا ذکر کر کے یہ بتاتا ہے کہ خدا پرستوں کی نگاہ میں دنیوی وجاہت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ ان کے خواب کی تعبیر کی وجہ سے بادشاہ ان کی عزت کرے گا مگر وہ قید خانہ سے نکلنا بھی پسند نہیں کرتے جب تک کہ اس الزام سے تمام لوگوں کی نظر میں پاک نہ ہو جائیں جو الزام لگا کر انہیں قید خانہ میں ڈالا گیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے معاملہ کو اس قدر وقعت دینا بتاتا ہے کہ یہی ان کے خلاف بڑی بھاری گواہی تھی۔

بخاری میں اس موقعہ پر تفسیر میں ہے: [وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوسُفُ، لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ] (صحيح البخاري،كتاب الانبياء، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ....، حديث: 3387) یعنی اگر میں قید خانہ میں اسی طرح رہتا جس طرح یوسف رہا تو میں بلانے والے کی بات کو مان لیتا۔ اس کا مطلب صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے اس فعل کی عزت ہے کہ کس قدر اپنی عفت کے معاملہ کو انہوں نے صاف کرنا چاہا اور قید خانہ کو الزام سے ملوث رہنے پر ترجیح دی۔ رہا یہ کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو قید خانہ میں نہ رہتا۔ تو وہ دوسرے نقطہ خیال سے ہے۔ اس لیے کہ آپ کا کام حضرت یوسف علیہ السلام کے کام کے مقابل میں اتنا بڑا تھا کہ آپ کو ان باتوں کی پروا نہ تھی کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ آپ کے مدنظر صرف دوسروں کی اصلاح کا عظیم الشان کام تھا۔ اگر اتنا بڑا کام حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد ہوتا تو وہ بھی الزام کی پروا نہ

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱

(بادشاہ نے) کہا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اپنے ارادے سے پھیرنا چاہا۔ انہوں نے کہا اللہ پاک ہے ہم نے اس میں کوئی بدی معلوم نہیں کی، عزیز کی عورت نے کہا اب حق کھل گیا، میں نے ہی اسے اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا اور یقیناً وہ سچوں میں سے ہے۔ (1551)

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ

(یوسف نے) کہا یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور

کرتے۔ ہاں یہ مرتبہ اس سے بھی بلند تر ہے۔ رہا تہمت سے بچنے کا معاملہ سو آنحضرت ﷺ کی یہی تعلیم ہے کہ تہمت کے موقعوں سے بچو اور خود آپ جب اپنی بی بی کے ساتھ کسی موقعہ پر کھڑے تھے اور پاس سے ایک صحابی کا گزر ہوا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ یہ میری بیوی ہے اور فرمایا کہ شیطان انسان کے دل میں طرح طرح کے وساوس ڈالتا رہتا ہے۔

1551 - خَطْبُ۔ [دیکھو نمبر: 1463]۔ اور خَطْبِ امر عظیم کو کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے سے بہت خطاب ہو۔ (غ)

﴿حَصْحَصَ﴾۔ حَصَّ کے معنی ہیں قطع کرنا چنانچہ حِصَّةٌ وہ ہے جو کل سے کاٹ دیا جائے اور حَصَّ اور حَصْحَصَ کے معنی ہیں ایک امر بالکل کھل گیا اور جس چیز نے اسے مغلوب کیا ہوا تھا وہ دور ہو گئی۔ (غ)

ہاتھوں کا کاٹنا یوسفؑ کے خلاف سازش تھی:

بادشاہ نے ان عورتوں سے یہ یوں خطاب کیوں کیا کہ کیا بات تھی جب تم نے یوسف کو ورغلانا چاہا۔ اس کی وجہ دو معلوم ہوتی ہیں۔ اول حضرت یوسف علیہ السلام کی راستبازی کا اثر جو ان پر اپنے مصاحب کے بیان سے ہوا اور خود اس خواب کی تعبیر میں جس علم کا اظہار ہوا اس نے بھی سب لوگوں کی گردنیں یوسف کے سامنے جھکا دیں۔ دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ سے بادشاہ کو جو کچھ کہلا بھیجا اس میں یہ بھی لفظ تھے کہ ان عورتوں کا ہاتھ کاٹنا ان کا کَیْدَ یا چال تھی جو میرے خلاف انہوں نے کی اور گو لوگوں کی نظروں سے وہ مخفی رہی مگر اللہ تعالیٰ تو اسے خوب جانتا تھا۔ یوسف کے یوں کہلا بھیجنے سے بھی بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ سب یوسف کے خلاف ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ عورتوں نے اس بات کو محسوس کر کے کہ یوسف کی راستبازی اب کھل چکی ہے اور یہ بھید بھی چھپا نہیں رہ سکتا صاف اقرار کیا کہ یوسف نے ہرگز ان کے متعلق کسی قسم کا برا ارادہ نہیں کیا۔ تب عزیز کی عورت بھی بول اٹھی کہ سچائی پر جتنے پردے ڈالے گئے تھے وہ اب دور ہو گئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قطع ید کے ذریعہ سے

اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآىِٕنِیْنَ ﴿۵۲﴾ کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ (1552)

یوسف علیہ السلام کی سچائی پر پردہ ڈالا گیا تھا۔

1552 - بظاہر یہ کلام عزیز کی عورت کے کلام کے سلسلہ میں ہے اور اس سے اگلی آیت کا مضمون بھی۔ مگر اس پر یہ صادق نہیں آتا۔ اور مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ کلام حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے۔ اور عموماً مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ عزیز کہ عورت یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی۔ خیانت کر کے تو اس نے اسے قید خانہ خانہ میں ڈلوایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیقات میں تو آخر ایک وقت لگنا تھا۔ تو لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا ہوگا کہ تم خواہ مخواہ کیوں قید خانہ میں پڑے ہوئے ہو، جس پر انہوں نے یہ فرمایا کہ تا بادشاہ کو علم ہو جائے کہ میں نے اس کی یعنی عزیز کی خیانت نہیں کی۔ اور یا اَخُنْهُ میں ضمیر بادشاہ کی طرف ہی لی جائے تو بادشاہ کی خیانت سے بھی مراد عزیز کی خیانت ہی ہوگی۔ کیونکہ اتنے بڑے عہدیدار شاہی کی خیانت باشاہ کی ہی خیانت تھی۔ اور ہدایت سے مراد یہاں منزل مقصود پر پہنچانا ہے۔ [دیکھو نمبر: 5]